

مولانا مودودی: مفکر، مصلح اور مدبر

پروفیسر خورشید احمد

بیسویں صدی نے تاریخ کے اوراق پر تباہی اور شکست و ریخت کے بڑے ہولناک نقوش ثبت کیے ہیں، لیکن اس کے ساتھ فکری اور تعمیری حوالے سے بھی اس کے دامن میں چند مثبت کارنامے اور بعض افادی پہلو نظر آتے ہیں۔

امت مسلمہ ایک طرف بدترین استحصال کا شکار ہوئی تو دوسری جانب اسے استعمار کی غلامی سے نجات بھی ملی اور تیسری جانب اس کے اندر ایسی تحریکیں برپا ہوئیں جنہوں نے امت کے اندر دینی بیداری اور اسلامی شعور پیدا کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ ان تحریکوں کے بعض داعیوں اور رہنماؤں نے مسلمانوں کو بحیثیت امت سر بلندی اور عظمت کی طرف لے جانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایسی شخصیات میں ایک نام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا بھی ہے۔

زیر نظر مضمون میں مولانا مودودی کی زندگی کے فکری پہلوؤں پر جو معروضات پیش کی جا رہی ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ مولانا مودودی کی شخصیت اور ان کے فکری و عملی کارناموں کی روشنی میں ہم بھی ایمان، دانش اور عمل کی راہوں کو کشادہ کرتے ہوئے اپنے زمانے کے درپیش چیلنجوں اور بحرانوں کا مقابلہ کریں۔ دو درجہ دید کی تاریخ میں حق و باطل کی کش مکش کا جب بھی ذکر ہوگا تو اس میں اس دور کی زمانہ ساز شخصیات اور تحریکوں کا بھی لازمی طور پر تذکرہ ہوگا۔ اس تذکرے میں مولانا مودودی کی کاوشوں کو ایک مرکزی اور کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدایے بخشدہ

○ پہلا حصہ ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۲۸ء تک مولانا مودودی کے فکری و عملی دور سے ان کی صحافتی زندگی کا زمانہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ اہم دور ہے اور اس میں ان کے مطالعے اور تحقیق کا زمانہ ہے۔ ایک لحاظ سے اس زمانے کو ان کے دور طالب علمی کا تسلسل بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان کے مختصر خودنوشت شذرات (notes) کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ان کا مطالعہ زیادہ تر قرآن پاک، حدیث نبوی اور تاریخ کے علاوہ دو درجہ دید کے علمی اور ادبی لٹریچر پر مشتمل تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم امت کو تہذیبی، سیاسی اور معاشی سطح پر ایک کش مکش کا سامنا تھا، مولانا کو اس کش مکش کا صحیح ادراک اسی دور (۱۹۲۰ء-۱۹۲۸ء) میں ہوا، جس کا ثبوت ان کے وہ مضامین ہیں جو اس زمانے میں انہوں نے الجمعۃ میں لکھے۔ اس علمی اور صحافتی سرمایے کو ظیل احمد حلدی مرحوم و مغفور نے چار جلدوں (آفتاب تازہ، بانگ سحر، جلوۂ نور اور صدائے رستاخیز) میں جمع کر کے محفوظ کر دیا ہے۔

○ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۲ء تک کے زمانے کو میں دوسرے دور کا حصہ سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ الجہاد فی الاسلام کی تسوید کا کام ۲۶-۱۹۲۵ء سے شروع ہو گیا تھا۔ ۱۹۲۷ء کے آخر تک اس کا پہلا مسودہ تیار ہوا تھا۔ اس کے بعد مولانا مودودی صحافت کو چھوڑ کر محقق، مفکر، مصنف اور صحیح کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس دور میں انھوں نے تاریخ اور ثقافت سے لے کر حدیث اور فقہ کے مباحث پر بڑی عرق ریزی سے کلام کیا۔ اس زمانے میں انھوں نے اسلام کے انقلابی تصور کو اس کی تمام جہتوں سمیت دیمل کی قوت سے واضح کیا، اور اس کے ساتھ ہی عصر جدید کے تصورات پر بھرپور گرفت بھی کی۔ اس دور میں مولانا نے قرآن و سنت کے ابدی پیغام کی شرح و بسط کے ساتھ ترجمانی کی اور یہ ترجمانی اس خوبی اور عمدگی اور اس شان سے کی کہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالمجید دریابادی جیسے بزرگوں نے ان کو ترجمان اسلام قرار دیا۔ یوں ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک یہ ساری علمی اور فکری جدوجہد وہ تنہا کرتے رہے۔

یہی زمانہ تھا جب ان کے ہم خیال جاں نثار دوستوں، حلیفوں اور ہم سفروں پر مشتمل ان کے حلقہ احباب میں وسعت پیدا ہو رہی تھی۔ مولانا مودودی اسلامیان ہند (خصوصاً مسلم اُمد اور بالعموم پوری نوع انسانی) کے مستقبل کے بارے میں جو تصور اور وژن (vision) رکھتے تھے اور جو تبدیلی وہ لانا چاہتے تھے وہ تنہا بروے کار نہیں لائی جاسکتی۔ اس مطلوبہ تبدیلی کا تقاضا تھا کہ ایک منظم اور مربوط اجتماعی جدوجہد کی جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ سید مودودی کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ بلاشبہ دور جدید میں اسلام کے احیاء کے لیے فکری کام بھی ضروری ہے، لیکن اس فکر کو بروے کار لانے کے لیے کسی عملی جدوجہد اور اجتماعی تحریک کے بغیر یہ عظیم کام نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ تجدید و احیاء دین اور مسلمان اور موجودہ سیاسی کنش مکش جیسی تصانیف ان کے اس ذہنی سفر کی عکاس ہیں، جو بالآخر ایک صالح جماعت کی ضرورت پر منتج ہوا۔

○ اگست ۱۹۳۱ء میں جماعت اسلامی کے قیام کے ساتھ ہی اس منظم اجتماعی جدوجہد کا دور شروع ہوتا ہے۔ البتہ اس سے پہلے ۱۹۳۸ء میں علامہ محمد اقبال مرحوم کی دعوت پر حیدرآباد دکن سے دارالاسلام (پنجاب) منتقلی، اور وہاں ادارہ دارالاسلام کا قیام، دراصل اس بڑے کام کا ابتدائی مرحلہ (spade work) تھا، جب کہ اس کی دہلیز (threshold) اگست ۱۹۳۱ء ہے۔ اس تین سالہ عرصے (۱۹۳۸ء-۱۹۳۱ء) میں وہ اُمت کی تعمیر اور اس کے اندر مطلوبہ تبدیلیوں کے لیے ایک متبادل شعور (alternative vision) کی پرورش کرتے رہے اور پھر اس کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے ایک ہمہ جہت اجتماعی جدوجہد کا آغاز کیا۔ تیسرا دور ۱۹۳۱ء سے وفات (۱۹۷۹ء) تک کا ہے، جب وہ رفیقِ اعلیٰ کے بلاوے پر ہم سے رخصت ہوئے۔ یہ ان کی زندگی کا سب سے زیادہ ہنگامہ خیز اور انقلابی دور تھا۔ جس میں سید مودودی کا وژن بھی کھلی کتاب کی طرح سب کے سامنے تھا۔ اس وژن کے مطابق زندگی کے نقشے کو ازسر نو تعمیر کرنے کی اجتماعی جدوجہد کے سارے خدو خال بھی صفحہ قرطاس ہی پر نہیں، بلکہ رنگ و بو کی اس دنیا میں اپنی تمام تر رعنائیوں اور تفصیلات کے ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے مجلے (ترجمان القرآن) سے شروع ہونے والی یہ جدوجہد نہ صرف برعظیم ہی کے طول و عرض میں تہلکہ مچانے کا باعث بنی، بلکہ ایک عالم گیر انقلابی تحریک کا روپ دھار گئی، اور اس چومکھی لڑائی میں سید مودودی کا عالم یہ تھا کہ

ایک دل ہے اور ہنگامِ حوادث اے جگر
ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں
اس طرح میں ان کی زندگی کو ان تین حصوں میں تقسیم کر کے غور کرتا ہوں۔

مولانا مودودی بحیثیت صحافی

اولیں دور صحافت میں بالکل نوعمری ہی میں مولانا مودودی نے بحیثیت ایک صلاح قلم اور بحیثیت ایک وسیع النظر صحافی کے اپنی منفرد اور غیر معمولی صلاحیت کار کا لوہا منوایا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ انھوں نے تاج مسلم اور جمعیت العلماء کے پرچے الجمعیتہ میں لکھا، بلکہ اس کے ساتھ نگار 'مدینہ' بجنور اور لاہور کے ہمایوں میں بھی مضامین لکھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ۲۲ برس کے نوجوان کو مسلمانوں کی اس وقت کی ایک اہم تنظیم جمعیت العلماء کے سرکاری ترجمان کی ادارت مکمل ذمہ داری کے ساتھ سونپی گئی جو مولانا مودودی کی غیر معمولی ذہانت اور ان کے کردار کی پختگی کے ساتھ جمعیت علمائے ہند کے قائدین کی مردم شناسی کا مظہر بھی تھی۔ خصوصاً مفتی کنایت اللہ اور مولانا احمد سعید اس نوجوان سے بے حد متاثر تھے۔ دوسری طرف مولانا محمد علی جوہر بھی چاہتے تھے کہ مولانا مودودی ان کے معاون کے طور پر ان کے تاریخ ساز اخبار ہمسرد کے عملہ ادارت میں شامل ہو جائیں۔ مراد یہ ہے کہ اس زمانے میں بحیثیت ایک صلاح قلم اور صحافی کے انھوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا لوہا منوایا تھا۔ اس زمانے میں مولانا نے ترجمے بھی کیے ہیں اور متعدد مضامین بھی لکھے، لیکن ان کا پہلا کارنامہ صحافت ہے۔

مولانا مودودی کے اس دور صحافت میں ہمیں پانچ چیزیں بڑی نمایاں نظر آتی ہیں:

● پہلی بات یہ ہے کہ نوجوانی کے باوجود ان کی تحریر میں بڑی پختگی ہے۔ الجمعیتہ کے زمانے کے مضامین اور بعد کی تحریروں کو دیکھیں تو زبان، اسلوب، اظہار خیال، حسن بیان اور رعنائی خیال میں بہت کم فرق نظر آئے گا۔ مجھے یہ بات کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ تحریر میں اتنی کم عمری میں ایسی پختگی، بڑی منفرد اور امتیازی خصوصیت ہے۔ اس سے قبل ہمیں یہ خوبی مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ شبلی نعمانی میں نظر آتی ہے اور بعد ازاں یہ چیز ہمیں سید مودودی میں بحیثیت ایک نوجوان صحافی کے نظر آتی ہے۔ البتہ آزاد اور شبلی کے برعکس مولانا مودودی کے ہاں ایک وسعت نظر، فکر میں ٹھہراؤ اور زیادہ کھلے پن کا احساس ہوتا ہے۔

● دوسری حیرت انگیز بات ان کے ہاں مطالعے کی ہمہ گیری اور حکمت و دانش کے متنوع ذخیروں سے اخذ و کتاب کے لیے حیرت انگیز محنت و کاوش نظر آتی ہے۔ دنیا کے حالات سے باخبری اور نہ صرف گونا گوں موضوعات پر اظہار خیال، بلکہ رائے کی پختگی کے نمونے اس زمانے کی تحریروں میں فراوان دکھائی دیتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مولانا مودودی خود اپنی فکر کو سنوار اور نکھار رہے تھے۔ ان کا وٹن اسلام کا سرچشمہ قوت کے مضامین کے ذریعے ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ لہجہ اور وسعت بیان ان کی تحریروں کے چار مجموعوں (آفتاب تازہ، بانگ سحر، جلوہ نور اور صدائے رستاخیز) میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

ان مضامین میں وہ پوری شرح و بسط سے بیان کرتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل دین اور انسانیت کے لیے ایک آفاقی پیغام ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انقلابی تحریک بھی ہے۔ ان مضامین میں مولانا کے ہاں زبان و بیان کی صحت اور اثر انگیزی کے ساتھ ساتھ فکر کی پختگی اور وسعت تہہ در تہہ نظر آتی ہے۔ ایک سہ روزہ اخبار میں خبروں کے انتخاب اور ترجمے کے ساتھ ادارہ نویسی اور کالم نویسی بذات خود بڑا جاں کسل کام تھا، جب کہ معاونت کے لیے اس کا عملہ بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس متفرق نویسی کے ساتھ وہ اعلیٰ درجے کے علمی و فکری مضامین بھی لکھتے رہے۔ یہ چیز تحریر و تصنیف پر ان کی ماہرانہ دسترس اور ان کی غیر معمولی دماغی قابلیت کا پتہ دیتی ہے۔

● تیسری چیز جس نے مجھے سحر زدہ کیا، وہ مولانا مودودیؒ کی شخصیت میں دماغ اور دل کا نہایت متوازن تعلق ہے۔ دماغ علامت ہے تفکر اور تدبیر کی اور دل نمائندہ ہے جذبات، احساسات، توقعات اور خواہشات کا۔ ان میں جب بھی تصادم اور تضاد ہو تو انسان بھٹک کر رہ جاتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا غلبہ ہو اور دوسرا معدوم تو شخصیت کا عدم توازن رونما ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان کے درمیان ایک صحیح توازن ہو تو متوازن شخصیت ابھرتی اور معتدل فکر رونما ہوتی ہے۔ میں نے اس زمانے میں مولانا کی تحریروں کا جو تجزیہ کیا ہے، اس میں کہیں کہیں فکر پر جذبے کا غلبہ نظر تو آتا ہے، جو ان کی عمر اور اس عہد (age) کے مسائل و مصائب اور حالات کا فطری تقاضا تھا، اس کے باوجود مجھے کہیں بھی عقل کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹنا نظر نہیں آیا۔

مثال کے طور پر ہندوستان کے صنعتی زوال اور اس کے اسباب ۱۶۰۰ء-۱۹۲۳ء کے موضوع پر قومی نقطہ نظر سے، مگر معتدل و متوازن انداز سے اظہار خیال کرتے ہوئے، سید مودودیؒ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: ”کسی ملک کی اقتصادی و تمدنی حالت پر غور کرتے وقت سب سے زیادہ توجہ کے قابل یہ امر ہوتا ہے کہ اس کا نظام حکومت کیسا ہے؟ یہ کلیہ قاعدہ ہے کہ قوموں کے بننے بگڑنے میں بڑا حصہ حکومت کا ہوا کرتا ہے۔ کبھی کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کا نظام حکومت درست نہ ہو، اور اسی طرح کوئی قوم تباہ نہیں ہو سکتی، تا وقتیکہ اس کا نظام حکومت خراب نہ ہو“ (ماہ نامہ نگار، اکتوبر ۱۹۲۳ء)۔ اس مضمون میں انھوں نے ہم وطنوں کی اقتصادی بد حالی کا مفصل نقشہ پیش کیا ہے۔ اس وقت ان کی عمر محض ۲۱ برس تھی مگر اس مضمون میں انھوں نے ایک سیاسی مدبر اور ماہر اقتصادیات کی سی پختہ فکر کے ساتھ خرابی کی اصل جڑ کی نشان دہی کی ہے۔ بعد ازاں ۱۹۳۹ء میں انھوں نے زیادہ واضح اور دو ٹوک انداز میں یہ مشہور جملہ لکھا: ”حکومت کی خرابی، تمام خرابیوں کی جڑ ہے“۔ حکومت کے کردار کے بارے میں یہ وژن سید مودودیؒ سے پہلے ابن خلدون کے مقدمہ تاریخ میں بھی نظر آتا ہے۔

اسی زمانے کی شاہکار تصنیف الجہاد فی الاسلام ان کی طبیعت پر زور استدلال اور توازن فکر کی دلیل ہے۔ اسی کتاب کی تصنیف کے دوران انھوں نے عملی صحافت کا میدان چھوڑ دیا۔ صحافت میں موضوع کا کیونوس اور دائرہ مخاطب بالعموم محدود ہوتا ہے اور فطری طور پر اس میں وقتی ردعمل اور جذبات کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ سید مودودیؒ نے اپنے مزاج کی مناسبت سے اس میں اپنا مستقبل نہیں دیکھا۔ وہ دل و دماغ کے اس امتزاج کی طرف جانا چاہتے تھے کہ جہاں قلب حرکت، جدوجہد اور ترغیب کا کام تو انجام دے، لیکن عقل اور فکر جس طرف لے جانا چاہتی ہے، وہ کسی حیثیت سے بھی نگا ہوں سے اوجھل نہ ہو جائے یا اس کے اوپر کوئی پرچھائیں یا سایہ نہ پڑ جائے۔ اس زمانے کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ ایک کش مکش سے گزر رہے تھے۔ وہ ایک فیصلہ کرنا چاہتے تھے اور بالآخر انھوں نے ریل کا کاٹنا بدلا اور جس ہٹڑی پر چاہتے تھے، اسی پر وہ آگے اور ہزاروں لاکھوں انسانوں کو بھی لے آئے۔ اس سے بھی زیادہ فیصلہ کن اقدام ان کی صحافتی زندگی میں ہمیں نمایاں نظر آتا ہے، جس کے تحت وہ ضمیر کی بیداری، خودداری اور حریت کو اولیت دیتے ہیں۔ گویا صحافی، صحافت کو محض قلم کاری نہ سمجھے بلکہ قلم کو فکر اور علم کی ترویج اور فروغ کے لیے ایک ایسا ہتھیار خیال کرے، جو دیانت کے ساتھ استعمال ہوتا کہ وہ دوسروں کی چاکری اور کاسہ لیسے کا آلہ کار نہ بنے۔

جمعیت العلماء، مسلمان علماء کی ایک ایسی قابل قدر جماعت تھی، جو اسلامیان ہند کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ بنیادی طور پر یہ کوئی علمی تنظیم نہیں تھی بلکہ ایک عوامی تحریک تھی، جس کی قیادت چند جمید علماء کے پاس تھی۔ تاہم یہی وہ زمانہ تھا کہ جب آہستہ آہستہ جمعیت کی اس وقت کی قیادت کا ایک بڑا حصہ انڈین نیشنل کانگریس کی فکر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ہندستان میں مسلمان اُمت کو جو بنیادی مُنحصہ (dilemma) درپیش تھا، اس کا فہم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مولانا مودودی کی فکر اور ان کے حقیقی کارنامے کو ذرا وسیع تناظر میں دیکھا جائے۔ جمعیت العلماء کی قیادت کے بڑے حصے نے وہ راستہ اختیار کر لیا، جس میں اسلام کی جگہ آزادی کو اولیت حاصل ہو گئی۔ یہاں اس چیلنج کو سمجھنا چاہیے جو اس وقت اُمت مسلمہ کو درپیش تھا، اور تاریخ کے مختلف ادوار میں بار بار پیش آتا رہا۔ اس چیلنج کو سمجھنے کی سنجیدہ کوشش ہی سے ہم علامہ اقبال اور سید مودودی کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور برعکس کے سیاسی منظر نامے ہی کو نہیں، بیسویں صدی کی پوری مسلم اُمت کی فکر اور سیاست کا بہتر فہم حاصل کر سکتے ہیں، بلکہ اب اکیسویں صدی میں جن حالات، مسائل اور چیلنجوں سے ہمیں سابقہ درپیش ہے، ان کا صحیح ادراک اور ان کے مقابلے کے خطوط کا متعین کرنے میں بھی مدد اور رہنمائی مل سکتی ہے۔

اس میں پہلا مسئلہ سب سے زیادہ گمبہر تھا۔ وہ یہ کہ ہجرت مدینہ کے بعد سے اٹھارہویں صدی تک، اسلام کا تہذیبی، تاریخی اور عالمی کردار درحقیقت ایک تاریخ ساز اور عالمی طاقت کا کردار رہا ہے جس میں ایک طرف قلب کی اصلاح اور کردار کی تطہیر اور تزکیہ ہے، دوسری طرف معاشرے اور تاریخ و تہذیب کی تبدیلی کا عمل۔ اسلام کا مزاج پہلے دن ہی سے یہی رہا ہے کہ اس نے طاقت کو محض سیاسی اقتدار سے عبارت نہیں کیا، تاہم سیاسی اقتدار اس کی طاقت کا ایک اہم عنصر ضرور رہا ہے۔ اسلام نے ایمان، دین اور طاقت کے درمیان ایک تعلق قائم کیا۔ اس تعلق کا اظہار صرف سیاسی طاقت ہی میں نہیں بلکہ معاشرے کے سارے اداروں میں ہوا، چنانچہ خاندان سے لے کر ریاست تک، یعنی نظام قانون، نظام قضا اور نظام معیشت، سب کو اس کا حصہ بنایا۔

خلافت راشدہ کے فوراً بعد مسلمانوں کو یہ مسئلہ پیش آیا کہ قوت تو اسلام کے پاس موجود تھی، لیکن اس کے لیے جو نظام اور جو ڈھانچا اسلام نے بنایا تھا، وہ متاثر ہونے لگا تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں نے اقتدار کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اسلامی قانون اور فقہ کی تشکیل میں بھی بڑی محنت کی۔ فکر مودودی کی روشنی میں یہ کہنا ضروری ہے کہ فقہ کی تدوین اور نظام قضا پر علما کی دسترس، ملوکیت کی انحرافی رو (deviationist wave) کے مد مقابل معاشرے میں ایک ایسے خود کار نظام کو فروغ دینا ایسا تاریخی کارنامہ تھا جس کے نتیجے میں معاشرے اور تہذیب و تمدن پر اسلام غالب رہا اور ریاست بھی اسلام کی گرفت میں رہی۔ سید مودودی نے اس تاریخی کارنامے کو خلافت و ملوکیت میں پیش کیا ہے اور اس میں ہماری تاریخ اور تدوین فقہ کی تحریک کا ایک ایسا پہلو سامنے آیا ہے جسے مورخین اور مفکرین نے بالعموم نظر انداز کر دیا تھا۔ بلاشبہ بارہ سو سالہ اس دور میں اتاریزہاؤ بھی آتے رہے تھے، لیکن اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے شروع میں یہ بات واضح ہو گئی کہ عالمی قیادت میں اب مسلمانوں کا کردار مضحک بلکہ ختم ہو رہا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں ان کا یہ کردار کم ہو کر بالکل چٹیل سطح کو چھونے لگا۔

اس طرح تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ صورت پیدا ہوئی کہ مسلمان سیاسی اور عسکری طور پر بے وقعت ہونے کے بعد ایک قابل ذکر قوت کے طور پر عالمی سیاست کی بساط سے یکسر باہر ہو گئے۔ گویا اقتدار پر ان کی گرفت ختم ہو گئی اور عالمی قیادت میں ان کا مقام اور وقار سرنگوں ہو گیا۔ جب ترکوں نے ۱۹۲۳ء میں خلافت عثمانیہ کو ختم کر دیا تو علامتی سطح پر بھی ان کی رہی سہی حیثیت کا خاتمہ ہو گیا۔ اب یہاں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جو حضرات جذباتی رد عمل رکھتے تھے، ان کی ساری توجہ خلافت کو بچانے اور ساری قوت خلافت کو بحال کرنے میں صرف ہوئی۔ لیکن مولانا مودودی، علامہ اقبال اور اسلامی تحریکات کی فکر کا تجزیہ کریں تو اندازہ ہو گا کہ انہوں نے خلافت کے احیا کو اصل ایٹھ نہیں بنایا، بلکہ اسلام کے احیا، اسلامی سوسائٹی کے قیام اور اسلامی ریاست کے حصول و قیام کو اپنا ہدف قرار دیا۔ اس طرح انہوں نے رسمی خلافت کے بجائے خلافت کے جوہر (essence) اور اس کے حقیقی مقصد اور ہدف کو اپنی منزل قرار دیا۔

اب ایک بڑا المیہ یہ ہوا کہ سیاسی قوت کے چھن جانے کے نتیجے میں مسلمان دوسروں کے غلام ہو گئے اور ایک دوسری تہذیب ان پر غالب ہو گئی۔ یہ تہذیب جن بنیادوں پر استوار تھی وہ اسلامی بنیادوں کی ضد تھی۔ اس طرح ایک تہذیبی کش مکش شروع ہو گئی جو مسلمانوں کے تصور جہاں، اقدار حیات، سماجی ادارات، انفرادی کیرئرز اور اجتماعی مزاج کو متاثر کر رہی تھی۔ اس تہذیبی کش مکش سے نکلنے کے لیے صرف جذباتی رد عمل کافی نہیں تھا، بلکہ ٹھوس فکر اور سوچے سمجھے انداز میں ایک متبادل لائحہ عمل، واضح نشان منزل اور ایک منظم و مربوط جدوجہد درکار تھی۔ ایک طبقے کے نزدیک اولین ہدف غیر ملکی استعمار سے آزادی حاصل کرنا تھا۔ اس طبقے نے اصل ہدف سیاسی آزادی کو قرار دیا۔ اس کے مقابلے میں اسلامی احیاء کے داعیوں کی سوچ یہ تھی کہ غیر ملکی استعمار سے نجات کے لیے جتنی ضروری سیاسی جدوجہد اور آزادی ہے، اتنی ہی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ان کے فکری اور تہذیبی غلبے کے خلاف پیکار ایک لازمی مرحلہ ہے۔ اور اگر استعمار کے اس فکری اور تہذیبی غلبے کو نظر انداز کیا گیا تو سیاسی جدوجہد بالآخر غیر موثر رہے گی۔ اس لیے اصل ضرورت یہ ہے کہ امت کو دین حق کی بنیاد پر اسلام کی بالادستی کے قیام کے لیے تیار کیا جائے، اور اسی جدوجہد کو استعمار کے خلاف مزاحمت کا ذریعہ بھی بنایا جائے۔

یوں اسلام اور مسلمانوں کو بہت سے بنیادی چیلنجوں کا سامنا تھا۔

اس سیاسی تہذیبی اور فکری پس منظر میں برعظیم کے مسلمانوں کا خیال تھا کہ برطانیہ نے چونکہ اقتدار ہم سے لیا ہے، اس لیے آزادی کے بعد بھی اقتدار ہمارا حق ہے۔ تحریک مجاہدین سے لے کر ہجرت اور ترک موالات کی تحریک تک اور جمعیت علمائے ہند سے دیگر انگریز مخالف تحریکوں تک کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کی قیادت مسلمانوں کے پاس تھی، اور وہی ان میں فعال اور فیصلہ کن حصہ لے رہے تھے۔ درحقیقت مسلمانوں کے دماغ میں یہی چیز تھی کہ آزادی ملنے پر فطری طور پر ہم اقتدار کے وارث ہوں گے۔ لیکن وہ اس جوہری فرق کو نظر انداز کر رہے تھے جو جمہوریت کے تصور پر مبنی اداروں کے قائم ہونے سے یہاں ووٹ کی قوت کے باعث متعارف ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کے برعکس ہندو اس کھیل کو بڑی کامیابی سے کھیل رہا تھا۔ اس چیز کو نظر انداز کر کے جمعیت العلماء نے جدوجہد آزادی کو اپنی اولین ترجیح قرار دیا۔ انھوں نے اپنی دانست میں یہی سمجھا کہ آزادی کا حصول ہی مسلمانوں کا سب سے بڑا اور واحد مسئلہ ہے۔

دوسری جانب مولانا مودودی اور علامہ اقبال کی فکر یہ تھی کہ فقط مسلمانوں کی آزادی نہیں بلکہ اسلام کی آزادی اصل مسئلہ ہے، اور مسلمانوں کو آزادی اگر اسلام کی آزادی کے بغیر ملتی ہے تو وہ غلامی ہی کی دوسری شکل ہوگی۔ اس لیے اسلام کی آزادی اور مسلمانوں کی آزادی دو ہی طرح ممکن ہے۔ یا تو مسلمان اتنے قوی ہوں کہ پورے برعظیم کی باگ ڈور سنبھال سکیں، جو بظاہر ممکن نہیں ہے۔ ورنہ پھر انھیں کوئی ایسا راستہ نکالنا پڑے گا جس میں وہ اپنے جداگانہ شخص کو محفوظ رکھ سکیں اور آزادی کے ساتھ ساتھ اپنے دین کی فضا اور اپنی ثقافت کے تحفظ کا بھی ٹھیک ٹھیک حق ادا کر سکیں۔ جس بات کو عرف عام میں 'دوقومی نظریہ' کہا جاتا ہے، اس کی فکری بنیاد یہ ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم دو جداگانہ نظریہ ہائے حیات کے علم بردار ہیں، اور آزادی کا وہی منہبوم انصاف کے تقاضے پورے کر سکتا ہے، جس میں ہر نظریہ اور تہذیب کو اپنا اپنا کردار ادا کرنے کا موقع ملے۔ اس کے لیے سیاسی، قانونی، ثقافتی، غرض ہر میدان میں ایک نئے دروبست کی ضرورت ہوگی۔

مولانا مودودی کی اس زمانے کی تحریروں میں آزادی، مسلمان اُمت اور ہندستان کے متعلق مسائل و معاملات پر مباحث ملتے ہیں۔ مولانا کا زاویہ نگاہ اس وقت بھی بڑا واضح تھا کہ اسلام کی آزادی اور مسلمان اُمت کی آزادی اسی وقت ممکن ہے، جب وہ اسلامی شخص سے وابستگی کو شرط اول قرار دے۔ اس شخص کی وضاحت اور اس کے حصول کے لیے مولانا ہر لمحے سرگرداں اور پریشان نظر آتے ہیں۔ برعظیم ان کی توجہ کا اولین مرکز ہے لیکن اس مرکز کا بیرونی حلقہ (circumference) بڑا وسیع اور دنیا بھر کے مسلمانوں پر محیط ہے، چاہے وسط ایشیا میں کمیونسٹ زاروں کے ہاتھوں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے المناک واقعات ہوں، یا افریقی ممالک میں قلم و زیادتی کا معاملہ ہو، یا ہندوستان میں ہندو انگریز گٹھ جوڑ سے مسلمانوں پر قافیہ حیات ننگ کرنے کا شیطانی کھیل ہو، وہ ہر مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کے احیاء کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ مغربی استعمار کے حلیف مسلمانوں کی فکری اور عملی حماقتوں کا بھی پردہ چاک کرتے ہیں جو مسلمانوں اور اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے دشمن سے بھی زیادہ بدتر کردار ادا کر رہے تھے۔ دوسری طرف اسی زمانے میں جمعیت کا نگرس کے ساتھ مل کر اس راستے کو اختیار کر چکی تھی جسے وہ 'سوراج' کہتے تھے۔ نتیجتاً علاقائی یا وطنی قوم پرستی ان کی نگاہ میں گویا مطلوب بن گیا تھا۔ بالکل یہی سوچ غیر مسلموں کی بھی تھی، اور مسلمان آزادی کی اس جدوجہد میں محض ایندھن کے طور پر استعمال کیے جا رہے تھے۔ یہ وہ کش مکش تھی جس میں مولانا مودودی نے اپنے لیے الگ راستے کا انتخاب کیا۔ اس لیے کہ وہ اپنے قلم کو اپنے ضمیر سے جدا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ان کی صحافت کا چوتھا امتیازی پہلو تھا۔

● ان کی صحافت کا پانچواں پہلو وہ ہے جس کی مثال ہمیں اخبار ساج، جبل پور [۱۹۲۰ء] کے زمانے میں ملتی ہے۔ ساج میں نام بطور مدیر تاج الدین صاحب کا آتا تھا، لیکن اسے مرتب سید مودودی کیا کرتے تھے۔ اس حوالے سے مولانا مودودی بتاتے ہیں: "ساج کچھ مدت تک ہفتہ وار نکلتا رہا، اور پھر روزانہ ہو گیا۔ میں تنہا اس کو چلاتا تھا۔ بد قسمتی سے میرے ایک مضمون پر حکومت نے گرفت کی۔ چونکہ اخبار کے ایڈیٹر پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے تاج الدین کا نام شائع ہوتا تھا، اس لیے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ گو اس طرح میں حکومت کی گرفت سے بچ گیا، لیکن مجھے اس سچے میں کوئی خوشی نہ تھی، اور آئندہ کے لیے میں نے عہد کر لیا کہ دوسروں کی ذمہ داری پر اخبار نویسی نہ کروں گا، بلکہ اپنی ہز جنش قلم کی ذمہ داری اپنے سر لوں گا۔" (مذکورہ سید مودودی، ج ۲، ص ۱۲۸-۱۲۹)۔ یہ بڑے اونچے کردار اور جرأت کی بات ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ اس وقت مولانا ابھی صرف ۱۸ سال کے نوجوان تھے۔ یہ واقعہ ان کے ضمیر کی بیداری اور ان کے کردار کے رخ کو متعین کرتا ہے۔

بحیثیت صحافی یہ امور مولانا مودودی کے زمانہ صحافت میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد کے دور میں بھی اگرچہ مولانا ان معنوں میں تو صحافی رہے کہ ایک ماہنامے کے مدیر تھے اور ایک ماہنامے کا مدیر بھی صحافی ہوتا ہے اور وہ خود بھی اپنے آپ کو صحافی کہتے تھے، تاہم اب ان کی تحریر ان کی سوچ اور ان کے انداز میں ایک تبدیلی آئی اور ان کے ہدف، اپنی صحافت کے دائرے سے نکل کر ایک زیادہ اہم، مشکل اور ٹھن میں داخل ہو گئے۔ یہ میدان تھا دین کی صحیح تعبیر، فکر اسلامی کی تشکیل جدید اور عالمی استعماری تہذیب کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کے کردار کی بازیافت کا۔ انسان سازی اور تاریخ کے دھارے کو تبدیل کرنے کے لیے جن عناصر اور قوتوں کی ضرورت ہے، ان کے لیے فکر مندی مولانا مودودی کے طرز فکر اور اسلوب زندگی کا ایک مستقل حصہ بن گئی۔ اب وہ ایک مفکر، مصلح، مدبر اور قائد کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔

مولانا کی نگارشات میں فکر کی گہرائی کے ساتھ ادب کی چاشنی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اور کہیں کہیں ادب کی یہ جولانیاں شاعرانہ اسلوب کی حدوں کو بھی چھوٹی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اخلاقیات اجتماعیہ اور اس کا فلسفہ پر بھی لکھا۔ اسی زمانے میں مشہور مصری دانش ور مصطفیٰ کامل پاشا کی کتاب المسئلة الشرقيه کا ترجمہ کیا۔

ان تمام تحریروں میں وہ اپنے مزاج اور موضوع کی مناسبت سے ادبیت اور متصدیت کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ مولانا کی تحریروں میں ابتدائی زمانے ہی سے ادب کی مٹھاس، صحت زبان، حسن بیان اور رعنائی خیال کا ایسا امتزاج پایا جاتا ہے جو ان کے طرز نگارش کو ایک انفرادی آہنگ عطا کرتا ہے۔ اولین دور میں مولانا مودودی کے ہاں دو زیریں لہریں (under currents) ہمیں متوجہ کرتی ہیں اور وہ دونوں ایک دوسرے سے نبرد آزما بھی نظر آتی ہیں: ایک شبلی کا اسلوب تحریر، دوسرا ابوالکلام آزاد کا انداز نگارش۔ ایک کی خصوصیت گنگا جمن کی میدانی علاقوں میں پرسکون روانی ہے، اور دوسرے میں پیٹری آبنبار اور پتھروں کو بہالے جانے والے پانی کے پُرشور دھاروں کا جوش و خروش۔ ان دونوں اسالیب سے مولانا نے استفادہ کیا ہے۔ دونوں کے کچھ نہ کچھ اثرات مولانا کے اسلوب پر نظر آتے ہیں۔ لیکن مولانا نے دونوں میں سے کسی کی تقلید نہیں کی اور نہ کسی ایک کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ میرے سوال کے جواب میں فرمایا: ”میں نے خود دنیا رنگ لیا۔“ ان کا یہ اسلوب، دور صحافت میں تشکیل پا چکا تھا۔ اس لیے میری نگاہ میں الجهاد فی الاسلام مولانا مودودی کے بنیادی فکری کا آئینہ ہے، بلکہ اس کتاب میں مولانا کے انداز تحریر اور اسلوب نگارش کی امتیازی صورت دیکھی جاسکتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ الجهاد فی الاسلام کے لیے تحقیق اور اس کی تحریر و تسوید مولانا مودودی کی زندگی میں ایک کلیدی موڑ اور امکانات کے وسیع افق روشن کرنے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ایک طرف تو انھیں اسلام کے تصور کائنات کو بالکل واضح حقیقت کے طور پر سمجھنے اور سمجھانے کا موقع ملا۔ دوسری طرف جو معذرت خواہانہ روایت مسلمانوں کی فکر میں جڑ پکڑ چکی تھی، اس کو انھوں نے بالکل ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا اور پوری متکلمانہ شان کے ساتھ اسلام پر اعتراضات کا دفاع کیا، ان کا جواب دیا اور اس سے بڑھ کر مثبت طور پر اسلام کی ایک جامع تصویر پیش کی۔ اس عمل میں انھوں نے ایک نیا اسلوب بھی اختیار کیا۔ اس علم کلام کی اصل خود اسلام میں موجود ہے۔ الجهاد فی الاسلام، مولانا مودودی کی زندگی کے رخ کو متعین کرنے والی کتاب ہے، اور یہ حسب ذیل تین حوالوں سے ہے:

اول: اسلام کے صحیح تصور حیات و کائنات کی بازیافت۔

دوم: یہ نکتہ کہ یہ تصور حیات فکری طور پر حق و باطل کی ایک عالم گیر کش مکش کی طرف لے جاتا ہے، جس میں اسلام کا تاریخی، بنیادی اور فطری کردار ہے۔ اس سے اسلام کا تحریری تصور ابھرتا ہے جو بالآخر بیسویں صدی میں اسلامی تحریکات کی صورت گری کا ذریعہ بنا ہے۔

سوم: یہ کہ اس تقاضے دین کی بجا آوری اور غلبہ اسلام کی جدوجہد میں ایک مرحلہ پر طاقت کے استعمال کا ایک متعین کردار ہے، وہیں صرف طاقت یا جنگ اس کا واحد ذریعہ نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ ایک ناگزیر پہلو ہے، لیکن ہر دور کے مسائل، معاملات اور زمینی حقائق کی روشنی میں غلبہ اسلام کے لیے ایسی حکمت عملی وضع کرنا ضروری ہے، جو اس مقصد کے لیے مددگار ثابت ہو اور اس میں مددِ اہت و پسپائی یا رخصت و دل شکنی کا شائبہ تک نہ پایا جائے۔ مکی دور میں بھی غلبہ اسلام مقصود تھا، لیکن یہ دور تیاری کا دور تھا۔ جس کی تکمیل اور تصفیذ ہجرت اور اس کے بعد ہوئی لیکن مکہ اور مدینہ دونوں اس تحریک کے لازمی مرحلے ہیں، جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ حراسے لے کر شعب ابی طالب تک، معراج سے ہجرت تک، بدر سے حنین تک، حدیبیہ سے فتح مکہ تک، سب اس وسیع تر حکمت عملی کے پہلو ہیں اور اس نمونے سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے امت مسلمہ کے لیے ضروری ہے کہ ہر دور میں حسب ضرورت ایک نیا نقشہ کار مرتب کرے۔ مدینہ کی ریاست کے قیام سے لے کر خلافت راشدہ تک کا دور ہی اصل اسلامی مثالیہ (paradigm) ہے۔

پھر سوال یہ پیدا ہوا کہ زمانہ خلافت کے بعد غلبہ اسلام کی کیا حکمت عملی ہو؟ یہ کیسے ہونا چاہیے؟ کیونکر ہونا چاہیے؟ گو اس پہلو کو مولانا مودودی کتاب میں لے آئے، لیکن محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت مولانا مودودی پر یہ پوری طرح واضح نہیں تھا کہ یہ کام کیسے کرنا ہے؟ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۸ء تک کا زمانہ مولانا کے فکر کے نگہار کا زمانہ ہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے مستقبل کے لیے امت کے سامنے ایک حکمت عملی پیش کی اور پھر اسے بروے کار لانے کا آغاز کیا۔ ان سبک ہائے میل اور پیش آمدہ چیلنجوں کے خدو خال مولانا مودودی کی تحریروں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

بحیثیت مصنف اور ادیب

اس دور کے بھی کئی حصے ہیں۔ ابتدائی چار سال تک تو انھوں نے خاموشی سے، مگر جم کر اور پوری یکسوئی سے مطالعہ اور تحقیق کے لیے اپنے آپ کو وقف رکھا۔ اس عرصے میں کچھ کتابیں بھی لکھیں، اور مستقبل کے منصوبے بھی بنائے۔ ان کے اپنے عزائم کو پختگی حاصل ہوئی اور رجحانات کی واضح صورت گری ہوئی۔ پھر ۳۳-۱۹۳۲ء میں یکسو ہو کر وہ اپنی زندگی کے اصل مشن کے لیے جہادِ زندگانی کے وسیع میدان میں سرگرم عمل ہو گئے۔ میری نگاہ میں اس جہادِ زندگانی کے شروعات کا بہترین اظہار مقرر جمان القرآن کے پہلے سات برسوں کے اشارات میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ اظہار مولانا کی شخصیت، وژن اور فکر کے ارتقا اور مولانا کے مستقبل کے تاریخی کردار کے سلسلے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ترجمان کی ادارت سنبھالتے ہی انھوں نے جو پہلی چیز لکھی وہ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی کے مضامین ہیں۔ بعد ازاں تنقیحات، سود، پردہ، اسلام اور ضبط و ولادت، تفہیمات کے مباحث ہیں۔ مولانا کے دوسرے دور حیات تک کی یہ مختصر سی جھلک ہے۔

۱۹۳۰ء کے عشرے میں ہم دیکھتے ہیں کہ کلامی، الہیاتی اور سائنسی موضوعات پر کلام کرتے ہوئے وہ مضبوط منطقی استدلال اختیار کرتے ہیں، لیکن جب معاملہ آتا ہے احساسات کو ابھارنے کا تو بعض تحریروں میں انھوں نے جھنجھوڑنے والا انداز بھی اختیار کیا۔ اس زمانے کی تحریروں میں مولانا کے ہاں انگریزی اور عربی کے الفاظ نسبتاً زیادہ ملتے ہیں، لیکن ۱۹۳۰ء کے عشرے میں ان کے اسلوب میں آسان زبان اور عام فہم انداز فروغ پذیر ہوتا ہے۔ اس سادہ نویسی کا شاہکار تفسیر القرآن اور خطبات ہیں۔ پھر آخری زمانے تک مولانا کا یہی انداز رہا ہے۔ گویا کہ ادیب کی حیثیت سے بھی مولانا کے ہاں ہمیں ایک ارتقا نظر آتا ہے۔ زمانہ صحافت میں انھوں نے دوسروں کے کچھ اثرات بھی قبول کیے، اور یہ بالکل فطری بات تھی، لیکن پھر ان کا اپنا طرز نگارش ابھر کر سامنے آتا ہے۔

مولانا مودودی کے طرزِ نگارش کا اگر کسی دوسرے صاحبِ اسلوب فرد کے ساتھ موازنہ کیا جاسکتا ہے تو وہ برٹریڈرسل ہے۔ اس کے ہاں بھی الہیاتی، سماجی اور تہذیبی موضوعات پر بحث ملتی ہے، جس کو وہ بڑی خوب صورت انگریزی نثر میں پیش کرتا ہے، اور صحتِ بیان اور سہل اسلوب کے ساتھ اظہارِ خیال کرتا ہے۔ بحیثیتِ ادیب، مولانا کی یہ بڑی قابلِ قدر خدمت ہے کہ انھوں نے اردو زبان کو علمی، دینی، تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی موضوعات سے مالا مال کرتے ہوئے اظہار کی ایک شان دار روایت قائم کی۔ ادب صرف افسانہ نگاری اور شاعری تک محدود نہیں، بلکہ وہ زندگی کے سارے سنجیدہ موضوعات کو مختلف ادبی پیرایہ ہائے اسالیب میں زیرِ بحث لاتا ہے۔ مقالے اور الہیاتی مضامین بھی ادب کے دائرے میں آتے ہیں۔

مولانا مودودی لکھتے وقت الفاظ کے انتخاب میں کسی تکلف میں نہیں پڑتے۔ وہ اپنی توجہ موضوع پر مرکوز کرتے ہیں، الفاظ خود بخود موزوں ہو جاتے ہیں۔ دینی فکر اور معاشرتی علوم کو انھوں نے نہایت خوب صورت زبان میں پیش کیا ہے۔ وہ صنائع اور بدائع کے استعمال میں بھی ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔ اگر ان کی نثر کا تجزیہ کیا جائے تو وہ کلاسیکی زمرے میں آتی ہے۔ یہ چیزیں تو اظہارِ من الشمس ہیں، اس کے ساتھ جو چیز نئی ہے وہ یہ کہ انھوں نے قرآنی اصطلاحات، قرآنی محاورے اور قرآنی پیغامات کو اردو زبان میں اس طرح سمودیا ہے کہ وہ اردو زبان و ادب کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ یہ مولانا کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

مولانا مودودی کی فکری اور ادبی تخلیقات روایتی مذہبی تحریروں سے بڑی مختلف ہیں۔ ان میں فکر کے عمق کے ساتھ زندگی کی حرارت اور ادب کی چاشنی ہے، جس نے ان تخلیقات کو یوتی ہوئی تحریریں بنا دیا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ان میں دعوت کی روح اس طرح سرایت کر گئی ہے کہ وہ حرکت کے لیے ممیز کا کام کرتی ہیں۔ وہ خود بھی بیدار ہیں اور دوسروں کو جگانے کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ ان کا اسلوب قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور پھر عمل اور حرکت پر اکساتا ہے۔ مولانا نے طنز اور مزاح کو بھی بڑی مہارت کے ساتھ استعمال کیا ہے، ان کی تحریر میں بلا کی شوخی ہے جو ان کی خوش ذوقی ہی کا ثبوت نہیں، بلکہ ادبی صنعتِ کاری کا بھی ایک نادر نمونہ ہے۔

آج کل مغرب کے زیر اثر ”اسلام کی اصلاح“ کرنے والوں کے لیے ترکی کے مصطفیٰ سال پاشا کا نام ایک رول ماڈل ہے۔ مولانا مودودی نے ۱۹۴۰ء میں اتاترک پر لکھی گئی ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایسے لوگوں کی ذہنیت کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا: ”[کتاب اتاترک کے] مصنف نے ازراہ انکسار اس کتاب کو اتاترک کی سوانحِ عمری قرار دیا ہے۔ لیکن اگر وہ اسے ”قصیدہٴ نعتیہ در شان اتاترک علیہ السلام“ کے نام سے موسوم کرتے تو زیادہ موزوں ہوتا۔ کتاب پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ترکی میں ایک نئی مبعوث ہوا تھا..... یہ مبالغہ جس شخص کے حق میں کیا گیا ہے اسے مرے ہوئے ابھی کچھ بہت زیادہ دن بھی نہیں گزرے کہ ماضی کے دھندلکے سے فائدہ اٹھا کر اسے دیوتا بنا ڈالا جائے۔ پرانے زمانے کے مچھر کو آج بھی بنایا جاسکتا ہے، مگر ہم عصریوں کی آنکھوں میں کہاں تک خاک جھونکیں گے... [کتاب کے مصنف کے بقول اتاترک] نے مذہب [اسلام] کی اصلی روح کو برقرار رکھتے ہوئے درویشوں اور مولویوں کی اجارہ داری کو ختم کر دیا۔

مذہب اسلام میں دنیاوی ترقیوں کا ساتھ دینے کی پوری پوری صلاحیت ہے، اس میں اگر کوئی کمزوری ہے تو وہ درویشوں اور مولویوں کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔ اسی خیال کے ماتحت ترکی کی سر زمین کو اتار کر نئے ملاؤں کے وجود سے پاک کیا، اور فی الحقیقت اتار کر کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ مذہبی اصلاح کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔۔۔ بے معنی الفاظ کا کتنا عجیب مجموعہ ہے۔ ان لوگوں کے ”چک دار اسلام“ کی کیا تعریف کی جائے [ان کے نزدیک] اس کم بخت میں اس غضب کی چک موجود ہے کہ دنیاوی ”ترقیوں“ کی خاطر قرآن کا قانون منسوخ کر دینے تک کی گنجائش اس میں نکل آتی ہے۔ اور اس ”مذہب اسلام کی اصل روح“ کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ ملا اور درویش کو سامنے رکھ کر اس طرح ڈانٹا مایٹ سے اڑائیے کہ قرآن و سنت بھی ساتھ ساتھ اڑ جائیں۔ اس کے بعد جو کچھ بچ رہے اس کا نام ’خالص روح اسلام‘ ہے۔۔۔

(ترجمان القرآن، مئی۔ جون ۱۹۳۰ء، ص ۳۲۲-۳۲۷)

مولانا مودودی مقصد سے لکھنے والے ایک ایسے ادیب اور مفکر ہیں جنہیں اپنے مخاطبین کے دل میں پیغام اتارنے اور ان کی شخصیت کو بدلنے سے غرض ہے۔ مگر وہ اس غرض کے لیے زور زبردستی کا ویسا رویہ اختیار نہیں کرتے، جو عموماً سیاسی یا مذہبی عناصر کے طرزِ مخاطب کی پہچان اور ان کا عیب ہوتا ہے۔ ادب نام ہے اثر انگیزی کا اور یہ اثر انگیزی مولانا کی تحریر میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اگر ہم انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے شروع کے دینی ادب کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے علمائے تفسیر، حدیث، سیرت، فقہ اور تاریخ پر بڑی گراں قدر کتب تصنیف کیں۔ لیکن ان کے اسلوب کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی تعلق اس دنیا سے نہیں ہے، جسے وہ مخاطب کر رہے ہیں۔ بعض مستثنیات کے سوا ان کی زبان اتنی ادق اور محاورے اتنے بوجھل اور مثالیں ایسی ہوش ربا ہیں کہ آپ ان میں سے کچھ مواضع کو تو محفل میں بیٹھ کر باوازی بند پڑھ نہیں سکتے۔ لیکن اُس زمانے میں دینی کتابوں کا کچھ یہی تھا۔ تاریخ پر مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی کتاب بڑی عمدہ ہے، لیکن اگر آپ جملے کی طوالت دیکھیں تو اندازہ نہیں ہوتا کہ کہاں جا کر ختم ہوگا۔ یہی صورت دوسرے علمائے تحریروں کی ہے حتیٰ کہ مولانا مناظر احسن گیلانی تک کا طرزِ تحریر اس روایت سے جان نہ چھڑا سکا۔ اس فضا میں مولانا نے دینی موضوعات پر تحریر و نگارش کا اسلوب بدل کر رکھ دیا۔ صاف نظر آتا ہے کہ دینی ادب کی زبان اور اسلوب بیان پر مولانا مودودی کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں اور بحیثیت مجموعی علمائے دین کی زبان و بیان اور ان کے اسلوبِ تحریر میں ایک واضح تغیر واقع ہوا ہے، مثلاً تفسیر میں مولانا عبدالحق کی تفسیر حقائق اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کا مطالعہ کیجئے اور پھر پیر کرم شاہ صاحب کی ضیاء القدر آن دیکھیے، ان کے اسلوب میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ اس اسلوبِ نگارش اور اندازِ تحریر کو جس شخص نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، وہ سید مودودی ہیں۔ بحیثیت ادیب مولانا کا یہ بڑا منفرد پہلو ہے، جس کا قراوقعی اعتراف نہیں کیا گیا۔ اگر انصاف سے کوئی نقاد تحقیق و تجزیہ کرے تو وہ دو اور دو چار کی طرح دکھا سکتا ہے کہ کیا فرق واقع ہوا ہے۔

بحیثیت مفکر، مصلح اور مدبر

ایک مفکر (thinker)، مصلح (reformer) اور مدبر (statesman) کی حیثیت سے مولانا مودودی کی شخصیت کو زیر بحث لانا ایک اہم موضوع ہے۔

جب اسلامی فکریات کے وسیع ذخیرے کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کی اسلامی فکر پر سب سے زیادہ جس شخص نے نہایت گہرے اثرات مرتب کئے، وہ مولانا مودودی ہیں۔ ان کی اثر پذیری کا دائرہ اپنی وسعت اور عمق کے اعتبار سے، اور اپنی اصابت فکر اور اپنے اثرات کے اعتبار سے منفرد مقام کا حامل ہے۔

بلاشبہ دوسرے مفکرین اور خادمانِ دین نے بھی بیسویں صدی میں اسلامی فکر کو مالا مال (enrich) کرنے کے لیے بڑی خدمت انجام دی ہے، اور ان کی حیثیت کہکشاں کے روشن ستاروں کی سی ہے اور اس میں ان کے ہاں ایک دوسرے سے اثر پذیری بھی نظر آتی ہے۔ تاہم میری نگاہ میں مولانا مودودیؒ کو جس بنا پر منفرد مقام حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے وہی کام کیا جو دوسری صدی ہجری سے چھٹی صدی ہجری تک اس وقت کے حالات کی روشنی میں اسلامی فکریات کے قائدین نے انجام دیا تھا۔ (ملاحظہ ہو میرا مضمون ”دینی ادب“ مشمولہ: تاریخ ادبیات پاک و ہند، ج ۱۰، ص ۲۶۱-۲۷۶، پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

اس کی ایک مثال اسلام کے لیے ”تحریک“ کے لفظ کا استعمال ہے، جو بیسویں صدی میں اسلامی احیاء کی علامت اور پہچان بن گیا۔ اس اصطلاح کی کچھ وہی حیثیت ہے جو دوسری صدی اور اس کے بعد کے زمانے میں ”شریعت“ کی اصطلاح سارے دینی لٹریچر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ قرآن پاک میں لفظ ”شریعت“ راستے اور طریقے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ البتہ ہماری فکری تاریخ میں لفظ ”شریعت“ دوسری صدی میں داخل ہوتا ہے، جب اس بات کی ضرورت تھی کہ اسلام کے پھیلاؤ اور نئے تہذیبی مسائل میں اسلام کی ابھرتی ہوئی قوت کو پیش آمدہ مسائل کا کیسے جواب دینا ہے؟ اسلامی دعوت، اسلامی حکومت، اسلامی سوسائٹی، اسلامی اداروں کو کس طرح اپنا کردار ادا کرنا ہے؟ سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ قرآن اور سنت کی روشنی میں اسلامی نظام زندگی کیسے پیش کیا جائے؟ اصول فقہ اور فقہ دونوں کی نشوونما ترقی اور ارتقا دراصل اس ضرورت کو پورا کرنے کی بروقت، موثر اور کامیاب کوشش تھی۔ اس عظیم کارنامے نے اگلے ۱۲۰۰ برسوں میں اسلامی تہذیب اور اسلامی ثقافت اور خود دین اسلام، اور اسلام کے سیاسی نظام کو ایک ایسا بنیادی ڈھانچا عطا کیا، جس سے وہ ہر طوفانی تھپیڑے اور ہر سیاسی نشیب و فراز کا مقابلہ کرسکا اور اس کے ذریعے وہ ہر دور میں مسلمانوں کو اسلام سے وابستہ کرسکا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ شریعت بحیثیت اصطلاح، اسلام کے فکری اٹاٹے میں شامل ہوئی۔

فقہ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض عبادات پر مشتمل نہیں ہے، بلاشبہ عبادات اس کا اولین موضوع ہیں، پھر خاندان اور عائلی زندگی وغیرہ کے معاملات۔ یہ دونوں موضوعات فقہی کتب کے تقریباً دو تہائی حصے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد فقہ میں مالی معاملات، معاشی احکام، تجارتی احکام، پھر قانون صبح و جنگ، معاہدات، سزائیں، تعزیر، حد اور سیر کے ابواب ہیں۔ سیر (قانون بین الاقوام) کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کے دوسرے ممالک سے کس طرح معاملہ کریں اور غیر مسلموں کے حقوق کی کیا صورت ہے؟ یہ تمام ابواب فقہ کے ہیں اور فقہ کا یہ نشوونما اور شریعت کا یہ وسیع تر نظام، دراصل قرآن و سنت کی دعوت کا فطری مظہر تھا۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جو دعوت پیش کی گئی تھی، جس نے ایک سوسائٹی، ایک تحریک، ایک ریاست اور ایک تاریخی رو کو پروان چڑھایا تھا، اس چیلنج کو نظریاتی، اخلاقی، قانونی اور اداراتی سطح پر ایک نیکل اساسی (infra-structure) کی ضرورت تھی۔ ان فقہانے اسے دو اور دو چار کی طرح واضح کیا تاکہ آنے والے کل کے مراحل کو طے کرسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہت کے باوجود قانون بادشاہوں کی مرضی کے تابع نہیں تھا بلکہ شریعت کا قانون تھا۔ کم و بیش ہر بادشاہ شریعت کے قانون اور قاضی کے حکم کے تابع تھا۔ اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب تحریک ایک حقیقت تھی تو اس کے ماحصل کو محفوظ و مستحکم کرنے کے لیے فقہ اور شریعت کی تدوین کی ضرورت تھی اور اس تاریخی عمل نے شریعت کی مرکزیت کو برگ و بار عطا کیے۔

پہلی اور دوسری صدی میں درپیش حالات کی طرح کچیلنج اُمت مسلمہ کو دوبارہ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے شروع میں بڑی شدت کے ساتھ پیش آیا، لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ تب فقہ تو موجود تھی لیکن وہ نظام باقی نہیں رہا جس کو چلانے کے لیے وہ فقہ مدون کی گئی تھی۔ شریعت کا وہ ڈھانچا تو موجود تھا لیکن شریعت کہیں بھی قانون ارضی (law of land) کے طور پر موجود نہیں تھی۔ مغربی سامراج نے مسلم ممالک پر قبضہ جمارکھا تھا۔ ممالک پر ہی نہیں بلکہ ذہنوں پر بھی سیاسی نظام پر بھی عدالتی نظام پر بھی اجتماعی نظام پر بھی معاشی نظام پر بھی، تعلیم پر بھی، حتیٰ کہ خاندان اور فرد پر بھی اس کی گرفت مضبوط تھی۔ اس منظر نامے میں یہ ایک ادھوری بات بھی کہ بس ”خلافت بحال کر دو“۔ جو شخص بھی اسلام کے مزاج کو سمجھتا تھا اور وقت کے بحران اور اس کی اصلاح کا صحیح نقشہ کار اس کے سامنے واضح تھا، اسے یہ بات بڑی سطحی اور غیر فطری لگتی تھی۔ ہم یہ دیکھتے ہیں اس موقع پر اُمت کے لیے ایک نقشہ کار اور ایک واضح حکمت عملی متعین کرنے کا جو کام مولانا مودودی نے کیا، وہ کم و بیش اسی نوعیت کا ہے جو دوسری صدی میں ہوا۔ تب ہم ایک نئی اصطلاح سے روشناس ہوئے اور وہ ہے لفظ ”تحریک“۔

جس طرح اولین دور میں لفظ ”شریعت“ نہیں تھا لیکن اسلام کے منشا کو بیان کرنے کے لیے ”شریعت“ کا جامع لفظ آیا۔ آج اگر کوئی سوال کرے کہ اسلام کیا ہے؟ تو اس کا فوراً جواب ملے گا ”شریعتِ اسلامی“۔ گویا شریعتِ اسلام کے نظام کار کی جسم کی صورت میں اس زمانے میں آئی، جب اسلام ایک غالب اور ایک تاریخ ساز قوت تھا۔ وہ قوت، اپنی اخلاقی اور تہذیبی برکت کے ساتھ دنیا کے شمال، جنوب، مشرق اور مغرب میں کارفرما نظر آ رہی تھی۔ اس زمانے میں اس کی حرکت کے پہلو کو یوں بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن جب حرکت اور پھیلاؤ کا وہ سلسلہ منقطع ہو گیا، اور اُمت جمود ہی کا شکار نہیں ہوئی، بلکہ اس کے ایک دوسری تہذیب کے سانچے میں ڈھل جانے کی نوبت آ گئی، تو نئی ضرورتیں ابھریں۔ اب اسلام صرف اقتدار ہی سے محروم نہ تھا، بلکہ وہ ادارے جو اسلامی تہذیب و تمدن اور معاشرت اور ریاست کے ستون تھے اور اس کی پوری عمارت کو تھامے ہوئے تھے، ایک ایک کر کے منہدم ہو گئے، اور ان کی جگہ ایک دوسری تہذیب سے درآمد شدہ اداروں کو مسلمانوں کی سرزمین پر مسلط کر دیا گیا تو ایک بالکل نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ اب شریعت کو دوبارہ زندگی کی رہنما قوت بنانے کے لیے ایک نئے وژن اور نئی اجتماعی تحریک اور نئی قیادت کی ضرورت تھی۔ اس بات کی ضرورت تھی کہ اسلام کا صحیح وژن، ایمانی دانش اور متوازن بصیرت کے ساتھ بیان کیا جائے، اس بصیرت کی وسعتیں اس کے ہدف کے ساتھ آشکارا کی جائیں، اس کو بروئے کار لانے کے لیے قوت عمل اس کے نظام کار کی بیج اور اس کے لوازمات کی فکر کی جائے۔ اور پھر عملاً وہ جدوجہد برپا کی جائے جو دین کی اقامت کا ذریعہ بن سکے۔

یہی وہ چیز تھی جس کے اظہار کے لیے مولانا مودودی نے دین و دعوت اور نظام زندگی اور قانون حیات کے تصورات کو ایک مربوط شکل میں پیش کیا۔ انھوں نے قوی دلائل کے ساتھ اسلام کا جو انقلابی تصور پیش کیا وہ ”تحریک“ کے لفظ میں ڈھل گیا۔ ان کے فکر کا اصل آہنگ یہ پیغام ہے کہ: اسلام ایک دین، ایک مکمل نظام زندگی ہے جو عقیدے اور عبادت کے ساتھ ساتھ قانون، ثقافت، طرز معاشرت، معیشت، سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کو ایک منطقی ربط کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اسلام محض ایک نظری فلسفہ نہیں، بلکہ عقیدہ، اخلاق، قانون، معاشرت، تہذیب و تمدن اور اقدار حیات کا ایک ایسا امتزاج ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کا صورت گر بھی ہے اور اس طرح وہ ایک تاریخی قوت ہے، جس کے داخلی وجود میں یہ صلاحیت کار ہے کہ وہ اپنے کو نافذ کرنے کے لیے لوگوں کو ترغیب دے، انھیں متحرک اور منظم کر کے ایک جدوجہد کا موج در موج حصہ بنا دے۔

دوسرے یہ کہ اسلام دین کے ساتھ ساتھ ایک پیغام، ایک دعوت، ایک تبدیلی کا عمل ہے۔ جب دین کی ان تینوں جہتوں کے ساتھ عقیدہ، عبادت، نظام زندگی اور قانون اور معاشرت اور پھر پیغام، دعوت، جدوجہد اور نفاذ کی منظم کوشش کی جائے تو سب مل کر اسلام کی حقیقی نشا بن جاتی ہے، جسے تحریک، کی اصطلاح سے سمجھا اور سمجھایا جاسکتا ہے۔

بعض علما نے مولانا مودودی کی اس پکار کو بدعت، قرار دے کر ناگواری کا اظہار کیا، کچھ نے بالکل ہی مسترد کر دیا، مگر ان افراد کے نامناسب رد عمل نے بہت جلد اپنی اپیل کھودی۔ آج ان پیشواؤں کے ارادت مند بھی انھی اصطلاحوں میں بات کرتے ہیں، جنہیں وہ کل مذموم قرار دے کر مولانا مودودی کے خلاف فتوؤں کی بارش کر رہے تھے۔ گویا وقت اور حالات کی مناسبت سے مولانا مودودی نے اسلام کے اصل پیغام کو اس کے جوہر سے جوڑنے، بیان کرنے اور دل و دماغ اور قول و عمل میں انقلاب برپا کر کے اس کو ایک زندہ تحریک بنانے کا کام کیا۔ مولانا مودودی اور اس دور میں احیائی فکر کے علم بردار مفکرین کا اصل کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے بیسویں صدی میں وہی کام کیا جو دوسری صدی ہجری میں اس وقت کے قائدین نے انجام دیا تھا۔ اس وقت ایک چلتے ہوئے نظام کو مستحکم کرنے اور انحراف کی یورش کے مقابلے کے لیے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ضابطے اور قانون کا پابند کرنا اصل ضرورت تھی اور اب قانون اور ضابطے کا ایک مثالیہ تو موجود تھا مگر وہ قوت قاہرہ مفقود تھی، کہ جس کے ذریعے نظریات نظام حیات بن جاتے ہیں۔

اب اگر آپ اس کی تہ میں جانا چاہیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ خلافت و اسلامی ریاست دراصل اس تحریک، اس جدوجہد اور تبدیلی کا نتیجہ ہوگی۔ اس کے لیے فکر کی تبدیلی، فکر کے ساتھ کردار کی تبدیلی اور کردار کے ذریعے معاشرے کی تشکیل نو کرنا ہوگی۔ اس مقصد کے لیے منظم جدوجہد کی اہمیت محتاج بیان نہیں، جو بالآخر اسلامی معاشرے، اسلامی تہذیب و ثقافت، اسلامی حکومت، اسلامی ریاست اور حکومت الہیہ کے قیام پر منتج ہوگی۔ دیکھیے کہ خلافت کی اصطلاح جس نے ۱۹۲۳ء میں ایک خاص انداز میں پوری امت کو صدمے سے دوچار کیا تھا، اس کے زیادہ جان دار متبادل کے طور پر حکومت الہیہ، اقامت دین، اسلامی نظام کے قیام کی تڑپ اور پیاس اپنے نئے روپ اور نئے وژن کے ساتھ کس طرح اس مقام تک آ پہنچی ہے۔

علامہ اقبال اور مولانا مودودی کے سامنے دراصل یہ بنیادی ایشو تھا۔ علامہ نے اپنے انداز و اسلوب اور اپنے دائرے میں اور اشاروں میں اور مولانا مودودی نے تفصیل و وضاحت اور تسلسل کے ساتھ اس کا جواب دیا۔ مولانا مودودی کی نگاہ میں اصل مسئلہ خلافت کے کسی روایتی ادارے یا symbol کا قائم ہو جانا نہیں، بلکہ خلافت تو اس وژن اور اس نئے عمل اور اس تہذیب کی سر تاج ہے جس کے لیے ہمیں اپنی توجہ مرکوز کرنی ہے، یعنی استخفاف فی الارض کی ذمہ داری کو پورے شعور کے ساتھ ادا کرنا۔

آج کے دور اور حالات میں خلافت اور اقامت دین کے لیے مطلوب بنیادوں اور لائحہ عمل کے جو خدو خال سید مودودی نے پیش کیے ہیں، اس ضمن میں سب سے پہلی چیز فکر اور فکر میں بھی اسلامی فکر کی تشکیل جدید، وقت کی غالب فکر پر گرفت، تنقید و تنقیح اور ایک نئے انسان کو تیار کرنا ہے۔ ایسا انسان جس کا وژن، اخلاق، کردار، صلاحیت کار، تعلیم، وسائل اور اوقات کار کے نئے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اس کے بعد دوسری چیز ایک منظم اور اجتماعی جدوجہد ہے۔ چونکہ یہ کام محض انفرادی طور پر انجام نہیں پاسکتا، اس کے لیے ایک منظم اجتماعی جدوجہد ضروری ہے۔ ایسے تمام اچھے انسانوں کو منظم کر کے اجتماعی جدوجہد میں لگا دینا، تاکہ اسلام وقت کی غالب قوت بن کر انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلا سکے۔ اس مطلوبہ قوت کا جو وژن سامنے آتا ہے وہ ہے تبدیل شدہ انسان اور اس کے ذریعے ایک اچھے معاشرے کا قیام۔ اس کے ادارات میں تعلیم، معاشرت، معیشت شامل ہے اور جس کا موثر ترین پہلو انقلاب قیادت اور اسلامی ریاست کا قیام ہے۔ صرف ایک خطے میں ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر اسلام کو ایک کارفرما اور قائم کی حیثیت سے سامنے لانا ہے۔

فکرِ اسلامی کی تشکیل نو

سید مودودی کے علمی کارنامے کا احاطہ اور جائزہ وقت کی اہم ضرورت ہے، مگر اس جائزے کے تقاضوں کو ماحقہ پورا کرنا بڑا مشکل اور محنت طلب کام ہے۔ بہر حال مندرجہ بالا معروضات کی روشنی میں کسی قدر غور و فکر اور مزید تحقیق و تحلیل (analysis) کے طور پر چند نکات مرتب کرنے کی جسارت کر رہا ہوں:

سید مودودی کے علمی کارنامے کی صحیح تفہیم کے لیے دو بنیادی باتوں کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے: اول یہ کہ ہماری تاریخ کی پہلی پانچ صدیاں اسلامی فکر کی تشکیل و تعمیر اور اسلامی تہذیب و تمدن کی صورت گیری اور استحکام اور ترقی کے باب میں اسلام کی اجتہادی اور انقلابی قوت کا ایک ایسا ماڈل پیش کرتی ہیں جو اسلام کے مزاج اور تاریخی کردار کو سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر ہم عرض کریں گے کہ دور رسالت مآب اور دور خلافت راشدہ نہ صرف اسلام کے معیاری ادوار ہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے اسلامی مثال کے خدو خال متعین کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد کے ساڑھے چار سو سال کے سیاسی تشیب و فراز سے اگر صرف نظر بھی کر لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ دور علوم اسلامی کی تدوین کا زریں زمانہ ہے۔ تفسیر، حدیث، اصول فقہ، کلام، فلسفہ، تصوف، ان سب کے لیے یہ تعمیر اور تشکیلی دور ہے۔ اور امام غزالی کی ذات اور کام میں اس دور کا حاصل دیکھا جاسکتا ہے۔

امام غزالی نے فقہ، کلام اور تصوف کے تینوں دھاروں کو اپنے وقت کے فکری اور تہذیبی چیلنجوں کی روشنی میں اپنی مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ ایک نامیانی اکائی (organic whole) میں مرتب اور منضبط کرنے کی بڑی راہ کشا اور کامیاب کوشش کی۔ پھر ایسی ہی ایک کوشش بارہویں صدی میں شاہ ولی اللہ مرحوم و مغفور کے کام میں نظر آتی ہے۔

سید مودودی کے کام کو بیسویں صدی کے فکری اور تہذیبی چیلنج کے پس منظر ہی میں سمجھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ فکری اعتبار سے ان کا کام غزالی، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کے کام کا تسلسل اور اس علمی روایت کے بیسویں صدی میں احیا کی ایک شان دار مثال ہے۔

دوسری چیز وہ فکری اور تہذیبی ماحول ہے جس میں سید مودودی نے یہ کام انجام دیا۔ اس میں مسلمانوں کا ۲۰۰ سال کا فکری جمود، مغرب میں نشاۃ ثانیہ (renaissance) روشن خیالی (enlightenment) اور لیبرل اور اشتراکی تحریکوں کا فروغ، صنعتی انقلاب، مغربی استعماری اور سرمایہ دارانہ قوتوں کا عالمی کردار پوری دنیا بشمول مسلم دنیا پر ان تسلط تھا۔ اس پس منظر میں شروع شروع میں مسلمانوں میں دور رجحان رونما ہوئے۔ ایک تحفظ اور اپنی میراث کو بچانے کے لیے قدامت پسندی اور جدید سے عدم تعاون اور اجتناب کا رویہ تھا، اور دوسری جانب اپنے شخص اور روایت سے بے نیاز ہو کر غالب قوت سے ہم آہنگی اور ہم رنگی اختیار کرنے اور لیبرلزم اور ماڈرنزم کے نام پر عملاً مغربی تہذیب، طرز فکر و عمل، سیاسی اور ثقافتی اداروں سے نئی نکلنا لوجی اور طرز معیشہ کو بلا تفریق و امتیاز (indiscriminately) اختیار کرنے کا۔

روایتی مذہبی طبقات پہلے راستے میں نجات دیکھ رہے تھے، اور جدید تعلیم یافتہ اور مراعات حاصل کرنے والے طبقات دوسرے کو ترقی کا زینہ قرار دے رہے تھے۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان ایک وسیع خلیج تھی جسے پُر کرنے کے لیے کئی موثر کوششیں ہوئیں، جن میں سب سے اہم اسلام اور مسلم تہذیب و تاریخ پر مسلمانوں کے اعتماد کو بحال کرنے کی وہ کاوش تھی، جو سید امیر علی، شبلی نعمانی اور ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین نے انجام دی۔

اس پس منظر کے ساتھ برعظیم پاک و ہند میں دو آوازیں ابھریں جو اپنی تازگی، وسعت اور انفرادیت (originality) کے اعتبار سے بظاہر اپنے ماحول میں اجنبی، لیکن دراصل اسلام کے پہلے ۵۰۰ سال کی روایت کے احیا کی نقیب تھیں۔۔۔ ایک اقبال اور دوسرے ابوالکلام آزاد۔ اپنے اپنے انداز میں دونوں نے اسلام کی راہ وسط کو اجاگر کیا اور قدیم اور جدید کے درمیان راہ صواب کی نشان دہی کی۔ لیکن صرف اس حد تک کہ جمود پر ضرب لگائی، مغربیت کے ظلم کو چیلنج کیا اور اسلام کے حقیقی پیغام اور مشن کی طرف مراجعت کی دعوت دی۔۔۔ جس شخص نے اس نقشے میں رنگ بھرا اور اس دعوت کو فکر و عمل دونوں میدانوں میں ایک حقیقی اور موثر تحریر بنانے کے لیے شب و روز وقف کر دیے وہ سید مودودی ہیں۔ جنہوں نے یہ کام روایت سے بغاوت کے ذریعے نہیں بلکہ روایت کو تجدید کے عمل کا حصہ بنا کر اور جدید کو نظر انداز کر کے نہیں بلکہ جدید کو اپنی تہذیبی اقدار کی کسوٹی پر پرکھ کر اور خذنا صفا و دع ما کدر (جو درست ہے اس کو قبول کر لو اور جو نادرست ہے اس کو رد کر دو) کے اصول کے مطابق انجام دیا۔ ان کے اس کام کے تین اہم پہلو ہیں:

۱- فکر اسلامی کی تشکیل نو

۲- امت کی کمزوری اور زوال کے اسباب کی تعیین و تشخیص اور اصلاح احوال کے خطوط کار کی نشان

دہی۔

۳- اصلاح کے نقشے کے مطابق تبدیلی اور تعمیر نو کی جدوجہد کا عملی آغاز

یہی وہ تین کام ہیں جس کے باعث بیسویں صدی کی تاریخ میں سید مودودی ایک مفکر، ایک مصلح اور

ایک مدبر کی حیثیت سے بڑا منفرد مقام رکھتے ہیں۔

اسلامی فکر کی تشکیل نو کے سلسلے میں اپنی تصنیفی زندگی کے ۶۰ برسوں میں سید مودودی نے تقریباً ڈیڑھ سو کتب کی تصنیف و تالیف کے ذریعے خدمت انجام دی۔ انہوں نے تفسیر قرآن، تشریح احادیث، تعلیم فقہ کے ساتھ اجتہاد، بصیرت سے دو حاضر کے جملہ اہم علوم اور مسائل کے بارے میں اسلامی فکر کے اساسی اصول پیش کیے۔ ان کے اجتہادی کام کا دائرہ چند گئے نئے مسائل تک محدود نہیں ہے بلکہ اصل ماخذ اور تاریخی روایت کے ساتھ پوری فکر اسلامی کی روشنی اور تسلسل میں تعمیر اور تشکیل نو ہے۔ مولانا مودودی کے اس کام کی انفرادیت، وسعت اور گہرائی پر برسوں نہیں صدیوں تحقیق ہوگی اور اس سے آنے والی نسلیں روشنی حاصل کریں گی۔

اس سلسلے میں سید مودودی کا سب سے بنیادی کام عقیدے کی تشریح اور توضیح ہے۔ سید صاحب کی فکر کو سمجھنے کے لیے سب سے کلیدی تصور، توحید کے عقیدے کی تشریح اور اس کے تقاضوں کی تعلیم ہے۔ قرآن نے اللہ اور رب کا جو تصور پیش کیا ہے، اس دور میں اس کی واضح ترین تعلیم سید مودودی کا سب سے بڑا فکری کارنامہ ہے۔ توحید کے تصور کو شرک کی تمام آلائشوں سے پاک کرنا اور اللہ کو اللہ ماننے کے مضمرات کو جس طرح سید مودودی نے بیان کیا ہے، وہ اظہار مدعا کی دنیا میں ایک انقلابی کارنامہ ہے۔ اللہ صرف خالق اور پالنے والا ہی نہیں ہے بلکہ وہ حاکم، آقا، مطاع اور ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ ایمان کے معنی ایک طرف اپنے پیدا کرنے والے کو پہچاننا اور اس کے دامن میں پناہ لینا ہے تو دوسری طرف اس سے عبادت کرنا ہے کہ پھر زندگی کے ہر شعبے میں اس کی رضا کا حصول، اس کے احکام اور ہدایت کی اطاعت اپنے آپ کو اور اپنے پورے معاشرے کو صیغۃ اللہ کے رنگ میں رنگ لینا ہی اس کا ترقی و کامیابی ہے۔

یہ تصور ایک طرف روایتی مذہبی جمود کو پارہ پارہ کر دیتا ہے تو دوسری طرف زندگی کو خانوں میں تقسیم کرنے اور الہامی ہدایت سے بے نیاز ہو کر محض عقل، تاریخ اور تجربے کے سہارے زندگی گزارنے والے تمام طریقوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ عبادت صرف مخصوص اسلامی مظاہر (rituals) کا نام نہیں بلکہ پوری زندگی کو مخصوص عبادت کی اداگی اور ان کی رمزیت اور اثر انگیزی کی قوت سے اللہ کی بندگی میں دینے اور اس کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنے کا نام ہے۔ اور اسلام ہے ہی وہ دین جو ایک طرف انسان کی پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے تو دوسری طرف انسان کو خالق کائنات کی مرضی سے ہم آہنگ (harmonize) کرنے کا وہ طریقہ ہے جس پر پوری کائنات عامل ہے۔ پوری کائنات اللہ کی مسلم ہے کہ اس کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق عمل پیرا ہے۔ جب انسان اسلام کے دائرے میں داخل ہو کر اللہ کے قانون کی اپنے ارادے سے پابندی کرتا ہے تو وہ پوری کائنات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس سے اسے حقیقی امن و سلامتی حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے رب اپنی ذات اور فطرت اور پوری کائنات کے ساتھ ہم آہنگی اور اطمینان کا رشتہ استوار کر لیتا ہے۔ اسلام کے معنی یہی سپردگی ہے جو اطمینان، امن اور سلامتی پر منتج ہوتی ہے (الَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ○ الرعد ۱۳: ۲۸)۔

توحید کے اس تصور کی وضاحت کے بعد سید مودودی اسی توحید کی بنیاد پر پوری انسانی فکر اور زندگی کے ہر شعبے کے لیے اسلامی تعلیمات کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دیتے ہیں۔ وہ قرآن و سنت اور اسوۂ رسول سے ثابت کرتے ہیں کہ اسلام ہی مکمل دین ہے اور زندگی کے ہر شعبے کے لیے کافی و شافی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اسلام کے نظام حیات کے ہر ایک پہلو کو انھوں نے شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا وہ کیا نقشہ کار ہے جو قرآن و سنت کی تعلیمات کی بنیاد پر ظہور پذیر ہوتا ہے اور ایک متوازن فکر انسانی اور علوم عمرانی کی تشکیل نو کس طرح ان بنیادوں کے اوپر انجام دی جاسکتی ہے۔ قانون، سیاست، معیشت، معاشرت، تعلیم، حقوق انسانی، عالمی نظام، غرض ہر پہلو پر انھوں نے اخلاقی دیانت، اجتہادی بصیرت اور عمیق تحقیق کے ساتھ اسلامی فکر کی تشکیل نو کی خدمت انجام دی ہے۔ فرد واحد نے وہ کام کر دکھایا جو بڑے بڑے ادارے اور محققین کی بڑی بڑی جماعتیں بھی بمشکل انجام دے پاتی ہیں۔

سید مودودی نے تاریخ میں اسلام اور جاہلیت کی کش مکش کی تصویر کشی کے ذریعے انسانی زندگی کے اصل ایٹوز کو مرتب کیا ہے اور بتایا ہے کہ آفرینش کے آغاز سے تاریخ دو ہی قوتوں کی پیکار کی آماجگاہ ہے ایک اسلام ہے اور دوسری جاہلیت (یعنی اللہ سے بے نیاز ہو کر زندگی کا نقشہ بنانے کی کوشش خواہ اس کا نام اور آہنگ کیسا ہی کیوں نہ ہو)۔ یہی وہ کش مکش ہے جس میں انسان کو استخفاف فی الارض کی ذمہ داری سونپی گئی ہے جو امت مسلمہ کا مشن، یعنی شہادت حق اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور جس کے لیے نفس سے جنگ سے لے کر کارزار حیات میں شر، ظلم اور فساد کے خلاف جہاد ہی اللہ کے بندوں کی اصل ذمہ داری ہے۔ تزکیہ نفس سے لے کر قتال فی سبیل اللہ تک، یہ سب اس نقشہ راہ کے مراحل ہیں۔ حق کے غلبے کی جدوجہد ہی ایمان کا اصل تقاضا اور ثمر ہے۔

سید مودودی نے اسلام کے اس وژن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جو کام کیا، اس کے تجزیے سے ان کے علم الکلام کے خدو خال مرتب کیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اسلام کے اولین دور میں وژن کی صحت اور جدوجہد کی قوت کا سرچشمہ قرآن سے براہ راست رہنمائی اور سنت رسول پر مضبوطی سے قائم رہنا تھا۔ بڑھتی ہوئی اسلامی قلمرو اور دنیا بھر میں مسلمانوں کے پھیل جانے سے جو نئے مسائل پیدا ہوئے تھے، ان کے حل کے لیے اسلامی فقہ کی تدوین، اجتہاد اور اجتہادی فیصلوں کی تحفید وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ لیکن مرور زمانہ کے ساتھ فکر، تعلیم اور معاملات کا کچھ ایسا آہنگ بن گیا کہ فقہ اور روایت کو اولیت حاصل ہوگئی اور قرآن و سنت سے بلا واسطہ ربط و رہنمائی میں اضمحلال آ گیا۔ جن نام نہاد مصلحین نے فقہ اور روایت سے بغاوت کی بات کی، وہ اسلام کی روح اور اس کے مشن سے ناواقف تھے۔ لیکن فقہ اور روایت سے رہنمائی اور تعلق کو منقطع کیے بغیر احیاء اسلام کے لیے ضروری ہے کہ قرآن اور سنت سے رشتہ استوار کیا جائے اور نئے حالات میں رہنمائی کے لیے ترتیب وہی قائم کی جائے جو دو راہوں میں تھی۔۔۔ یعنی قرآن پھر سنت اور پھر اجتہاد۔ جس میں سلف کے اجتہاد اور اس کے نتیجے میں ظہور میں آنے والی فقہ سے اصولوں کے مطابق استفادہ ہے۔ پھر جس طرح اصولین نے اپنے زمانے میں اپنے وقت کے علوم اور مسائل کو سامنے رکھ کر اسلام کی رہنمائی کو متعین کیا، اسی طرح آج کا ماحول اس پورے علمی اثاثے کو سامنے رکھ کر لیکن جدید علوم اور عصری مسائل کے حقیقی ادراک کے ساتھ غور و فکر اور اجتہاد و استنباط کے سلسلے کو آگے بڑھانا ہے۔ اس کے لیے سائنس، عمرانی علوم اور دو جدید کے اس 'عرف' کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے، جو مقاصد شریعت سے ہم آہنگ اور احکام اسلام سے متصادم نہ ہو۔

حقیقاً تجزیے، استنباط اور اطلاق کی یہ وہ حکمت عملی ہے جو سید مودودی نے اختیار کی۔ اسی طرح ان کے علم الکلام میں دو جدید کے تقاضوں اور ضرورتوں کو سامنے رکھ کر اسلامی علوم و افکار کی تشکیل جدید ہی نہیں بلکہ فکر انسانی کی تشکیل نو کے اس عمل کو انجام دیا جانا چاہیے۔ اس کے خطوط کار کا تعین اور اس کے استعمال سے حاصل شدہ نتائج کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ گویا فکر اور فکری عمل کو آگے بڑھانے کے راستے اور طریقے بتا کر ان دونوں میدانوں میں بھی سید مودودی نے نئے چراغ روشن کیے اور مستقبل میں کام کرنے والوں کے لیے تابندہ نقوش راہ چھوڑے۔ ان کے سارے کام کا ہدف اللہ سے بندوں کو اللہ سے قریب کرنا اور ان کے اندر اپنے رب سے مغفرت کی طلب بڑھانا تھا۔ لیکن فرد کی اصلاح، فکر کی تشکیل نو، وقت کے فتنوں اور چیلنجوں کا جواب، اسلامی زندگی، مسلم معاشرہ، اسلامی ریاست اور اسلام کے عالمی نظام کے خدو خال کی وضاحت کے ساتھ ان کی توجہ ایک اور کلیدی نکتے پر مرکوز رہی، اور وہ یہ کہ اچھے انسانوں کی تیاری کے ساتھ اجتماعی جدوجہد اور معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے ذریعے انقلاب قیادت کا معرکہ کیونکر سر کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عملاً مربوط و منظم جدوجہد کی کہ دین کے قیام، اسلامی معاشرے اور ریاست کے قیام اور ہر سطح پر قیادت کی تبدیلی اور فاسد قیادت سے زمام کار، صالح قیادت کی طرف منتقل کر کے انسانیت کی قیادت اہل خیر کے ہاتھوں میں لانی جاسکے۔ سید مودودی کی فکر کا مرکزی نکتہ توحید کے تصور کی وضاحت ہی نہیں ہے بلکہ توحید کے تصور کی بنیاد پر انسان سازی اور زمانہ سازی کا عمل ہے۔ یہ کام انھوں نے فکر کے میدان میں بھی انجام دیا اور پھر ایک مصلح کی حیثیت سے عملاً اس جدوجہد کو برپا کرنے کی سعادت بھی حاصل کی۔

یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ مولانا مودودیؒ ایک دیدہ ورمفکر تھے، جن کے ہاں فکری ارتقا جاری رہا۔ وہ تحقیق اور دلیل کی بنیاد پر اپنی آرا پر نظر ثانی کے لیے کھلا دل اور ضروری لچک رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر ابتدا میں پہلے تحدید ملکیت زمین کے بارے میں مولانا کا کم و بیش وہی نقطہ نظر تھا، جس پر فقہا عامل تھے۔ تاہم، جماعت اسلامی کا منشور تیار کرنے کے مختلف مراحل (۱۹۵۱ء تا ۱۹۷۰ء) میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر لاحد و دملکیت زمین قلم اور انسانی سماج میں شدید عدم توازن کا باعث بن جائے تو زمین کی حد مقرر کی جاسکتی ہے۔ اس میں ناجائز ملکیتی زمینوں کو بحق سرکار ضبط کر کے ضرورت مند کاشت کاروں میں تقسیم کیا جانا چاہیے اور جائز ملکیتوں میں زرعی اور بارانی زمینوں کو ایک حد سے زیادہ کی صورت میں ریاست خرید کر مستحق افراد کو دے سکتی ہے۔ ان کے ہاں یہ تحدید کمیونسٹوں کے تو میمانے والے تصور سے بالکل مختلف اور عدل پر مبنی ہے۔

مولانا مودودی کے ہاں جمود نہیں ہے، وہ سوچ کر رائے قائم کرتے تھے لیکن اپنی رائے پر قفل نہیں لگاتے تھے۔ شورئی میں تو میں نے دیکھا کہ مولانا نے لوگوں کو گھنٹوں بحث کرنے کا موقع بھی دیا ہے اور اپنی آرا کو تبدیل بھی کیا ہے۔ ہم سب ان کے شاگردوں اور خوردوں میں سے ہیں لیکن وہ ہماری رائے کو بھی پوری توجہ سے سنتے تھے، نوٹس لیتے تھے، جواب میں دلیل دیتے تھے اور پھر قائل کرنے اور قائل ہونے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ایسے بلند پایہ انسان کا ایسے کھلے انداز میں شورائی آداب پر عمل کرنا، حقیقت یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ ہی کا حصہ تھا۔

زندگی کے نئے مسائل اور نئی الجھنوں پر جب بھی سوچنے کا مرحلہ آتا تو مولانا اس پر از سر نو غور کرتے تھے۔ جس چیز کے ایک سے زیادہ حل ہو سکتے تھے، ان میں ترجیح قائم کرتے تھے۔ مجھے مرکزی شورئی میں دو دن تک جاری رہنے والی وہ بحث اچھی طرح یاد ہے جس میں جداگانہ انتخابات کے مسئلے پر بات ہوئی تھی۔ یہ بحث محض نظریاتی نہیں تھی، بلکہ یہ اخلاقی اور اصولی حوالے کے ساتھ ساتھ عملی سیاست کے گہرے ادراک پر مبنی تھی۔ اس پر شورئی میں دو آرا موجود تھیں۔ مولانا نے ایسے امور کو بڑی نزاکت سے نبھایا اور شورئی میں بالآخر زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے (near consensus) کی کیفیت پیدا کی۔

میدان عمل میں رہنما خطوط کا تعین

مولانا مودودیؒ ایک مصلح کی حیثیت سے محض ایک نظریہ ساز (theorist) نہیں ہیں، بلکہ ایک عملی مصلح (active reformer) کی حیثیت سے ان کی نگاہیں ہمیشہ زمینی حقائق پر مرکوز رہتی ہیں۔ ایک ہمدرد معالج کے طور پر وہ مریض کو صحت یاب دیکھنے کے معنی نظر آتے ہیں اور مریض کی حالت کے مطابق نسخے میں ترمیم و تبدیلی بھی کرتے ہیں۔

عملیت پسند مولانا مودودیؒ میں خود اعتمادی تو بلا کی تھی، مگر خود پسندی کا کوئی شائبہ بھی ان کی زندگی میں نہ تھا۔ وہ نئے حالات میں دین کی روشنی میں نئے تجربات اور نئے راستے نکالنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند اور پورے عالم اسلام کی اصلاح کا انھوں نے بیڑا اٹھایا، اور اس عملی جدوجہد میں اپنا صحیح کردار ادا کرنے اور قیادت کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ جتنا بڑا کارنامہ انھوں نے فکری حیثیت میں انجام دیا، اتنا ہی بڑا کارنامہ انھوں نے عملی سطح پر بھی انجام دیا۔

اس کے لیے انھوں نے ایک جماعت بنائی مگر جماعت اسلامی کا قیام بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دینے کے مترادف ثابت ہوا۔ جوں ہی انھوں نے جماعت بنا کر دعوت عام دی تو وہ لوگ بھی جوان کو ترجمان اسلام کہتے تھے نہ صرف پیچھے ہٹ گئے بلکہ ان کے ناقد بن گئے۔ مولانا نے نئے حالات میں اسلامی فکر کے احیا اور تکمیل نو تک اپنی مساعی کو محدود نہیں رکھا، بلکہ دنیا کو بدلنے کی مسلمانوں کو بیدار کرنے کی اہمیت کو شہداء علی الناس کا کردار ادا کرنے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری نبھانے اور اقامت دین کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے سرگرم کر دیا۔ ان کی ذات میں مفکر اور مصلح، داعی اور منتظم، قائد اور مدبر کی صلاحیتوں کا اجتماع تھا۔ یہی وہ پہلو ہے جو ان کے کردار کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔

● جدید خطوط پر تنظیم سازی: مولانا مودودی نے اپنے عہد کی سرکردہ تنظیموں کے تنظیمی ڈھانچوں اور نظاموں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام کو ایک انقلابی تحریک کی ضرورت ہے جو محض ایک سیاسی تنظیم نہ ہو۔ اس تناظر میں جماعت اسلامی کا وجود دراصل ایک نظریاتی تحریک کا روپ ہے۔ بنیادی پہلو یہ ہے کہ مولانا نے جماعت کے دستور میں پہلے ہی دن سے جو بنیادی چیز رکھی ہے وہ اس کا اثر ہے جس میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تصور اور اس کے تقاضے جماعت اسلامی کا محور ہیں۔ جماعت کے دستور کا سب سے اہم حصہ یہی ہے۔ اس میں پہلی بنیادی چیز اللہ کی حاکمیت، دین کی اقامت، حکومت الہیہ کا قیام اور زندگی کے پورے نظام کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر از سر نو مرتب کرنے کا عزم اور سرگرم جدوجہد کا عہد ہے۔ اس میں دوسری بنیادی چیز یہ ہے کہ ہر انسان قابل احترام ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی معیار حق نہیں۔ اصل کسوٹی اور معیار اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ باقی سب کو اسی میزان پر پرکھا جائے گا اور جو جتنا اس معیار سے قریب ہوگا وہ اتنا ہی محترم ہوگا۔ جماعت کے قیام میں یہ اصول بھی کارفرما رہا کہ اس کی رکنیت بلا امتیاز تمام مسلمانوں کے لیے کھلی ہے۔ لیکن رکن وہ بنے گا جو شعوری طور پر اس ذمہ داری کو قبول کرے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کا عہد کرے۔

مسلم تاریخ میں بیعت امیر کے ہاتھ پر ہوتی تھی اور امیر کے مرجانے کے بعد دوسرے فرد سے بیعت ہوتی تھی۔ لیکن مولانا مودودی نے نظام تنظیم کو بدل کر رکھ دیا۔ انھوں نے کہا: دعوت ندو امیر کی طرف ہے اور نہ بیعت امیر کی طرف، بلکہ دعوت بھی جماعت میں متعین کردہ نصب العین کی طرف ہے اور بیعت بھی جماعت کے ساتھ ہے، جسے حلف رکنیت کی شکل دی گئی۔ امیر پر نظام کو چلانے کی ذمہ داری ہے، وہ اس کی قیادت تو کرے گا، اور بحیثیت امیر نظام جماعت کے تحت اس کی اطاعت فی المعروف بھی ضروری ہے، لیکن امیر بھی اسی طرح دستور کا پابند ہے جس طرح ایک رکن۔ اسی طرح اطاعت نظام امر کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ دعوت امیر کی طرف نہیں، جماعت اور اس کے مشن کی طرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت کا نظام معروف میں اطاعت اور منکر میں احتساب سے عبارت ہے۔ یہ جماعت کے اجزائے لاینفک ہیں۔ میرے علم کی حد تک مسلمانوں کی اجتماعیت کی تاریخ میں مولانا مودودی نے پہلی مرتبہ تحریری دستور کے اندر احتساب کے حق کو حق ہی نہیں، ذمہ داری قرار دیا ہے۔ ہر رکن شوریٰ اور پورا نظام امر، احتساب کے عمل میں شامل ہے۔ ہر رکن یہ عہد کرتا ہے کہ میں جہاں نہیں کوئی برائی دیکھوں گا، اس کی اصلاح کی کوشش کروں گا۔ مراد یہ ہے کہ رکنیت کے وجود میں احتساب کا حق ہی نہیں فرض بھی شامل ہے۔ دستور میں شوریٰ کے منصبی فرائض میں بھی احتساب شامل ہے۔ یہ اصول تو بڑی جمہوری پارٹیوں میں بھی نہیں ہے۔ پاکستان کی چھوٹی بڑی سیاسی پارٹیوں اور مذہبی جماعتوں کے نظام کار کا جائزہ لیجیے تو نظر آتا ہے کہ یا تو وراثت کا نظام کار فرما ہے یا جس فرد کا وراثت، دولت اور اقتدار کے بل پر پارٹی پہ قبضہ ہے، وہی حرف اول ہے اور وہی حکم آخر۔

اس کے بعد ہے اختلاف رائے کا حق۔ مولانا مودودی نے اسے بھی ایک دستوری حق قرار دیا ہے، یعنی آپ پالیسی سے اختلاف رکھ سکتے ہیں، عقیدے سے نہیں۔ امیر سے اختلاف رکھ کر بھی آپ جماعت کے رکن رہ سکتے ہیں اور ایک وقت کی طے شدہ پالیسی کو بدلنے کے لیے افہام و تفہیم اور معروف شورائی ذرائع سے کوشش کر سکتے ہیں۔ جماعت کے دستور میں بھی شورائی نظام کا ارتقا ہوا ہے، اور ایک تدریجی عمل سے گزر کر جماعت نے ایک طرف امیر کو قیادت اور رہنمائی کا اختیار دیا ہے تو دوسری طرف پالیسی کو شورائی کے فیصلے کا بائند کیا ہے، جب کہ آخری فیصلہ شورائی یا اجتماع ارکان کا استحقاق ہے۔ اس عمل سے شورائی کی برتری زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔

● نظام کسی تبدیلی کا طریق کار اور حکمت عملی: مولانا مودودی نے ملکی نظام میں تبدیلی کا جو طریق کار پیش کیا ہے، وہ افکار کی تبدیلی، کردار کی تعمیر اور رائے عامہ کی ہموازی کے لیے جمہوری قانونی اور دستوری طریقے کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جماعت کے دستور میں اس طریق کار کو دو ٹوک انداز میں پیش کیا گیا اور عملاً ملک کی سیاست میں دستوریت (constitutionalism) اور جمہوری ذرائع سے تبدیلی کی جدوجہد کی مثال قائم کی گئی۔ وہ سختی سے اس راستے پر کاربند رہے اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو بھی اس کی دعوت دی۔ انھوں نے کھلے الفاظ میں کہا: خفیہ جماعتوں کا طریقہ اختیار نہیں کیا جائے گا۔ عرب ممالک میں چونکہ یہ رجحان گڈڈ تھا، اسی لیے عرب نوجوانوں سے مولانا مودودی نے خطاب کرتے ہوئے یہی فرمایا کہ میں آپ کو تلقین کرتا ہوں کہ آپ ان طریقوں کو اختیار نہ کریں جو فساد فی الارض کا ذریعہ بنتے ہیں۔ البتہ مسلمان جہاں پر محکوم ہیں اور غیروں کی غلامی میں ہیں، اور ان کے لیے سیاسی جدوجہد کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ وہاں آزادی کے لیے ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا کہ وہ جہاد کی راہ اختیار کریں تو یہ ان کا حق ہے۔ لیکن جن معاشروں میں آزادی ہے اور تبدیلی کے کچھ بھی جمہوری ذرائع موجود ہیں، وہاں آئینی اور جمہوری طریقے سے تبدیلی لانا ہی مولانا کی نگاہ میں اور جماعت کے دستور کے تحت تبدیلی کا صحیح طریقہ ہے۔

یہاں ہمیں مولانا مودودی مرحوم کی فکر کا یہ بڑا اہم نکتہ ملتا ہے، جسے علم الیاست میں ارتقائی عمل اور انقلابی عمل کہا جاتا ہے۔ مولانا نے بالکل ایک سچ کا راستہ نکالا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان کے تمام مقاصد تو انقلابی (revolutionary) ہیں، لیکن ان کے حصول کے لیے طریقہ کار ارتقائی (evolutionary) ہے۔ اسلامی انقلاب ہمارا مطلوب ہے، لیکن اس انقلاب کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی مختصر راستہ (short cut) نہیں ہے اور نہ جبر کا کوئی طریقہ اس منزل کے حصول کے لیے مدد و معاون ہو سکتا ہے۔ مولانا مودودی ذہنوں، معاشرے اور کردار کی تیاری کے ذریعے رائے عامہ کو قائل کرتے اور اس طرح قیادت کی تبدیلی کا راستہ بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: قیادت کی تبدیلی کا لازمی تقاضا یہی ہے۔ پہلے مولانا کا خیال تھا کہ اسلامی ریاست میں سیاسی پارٹیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ لیکن بعد میں انھوں نے محسوس کیا کہ اگر سیاسی پارٹیاں ان حدود کی پابندی کریں، جو شریعت نے اجتماعی زندگی کے لیے مرتب کی ہیں تو وہ اس ریاست کے نظام کار کو چلانے کے لیے نہ صرف معاون بلکہ ضروری ہیں۔ خاص طور پر سیاسی آزادی اور اختلاف رائے کو اداراتی اور منظم شکل دینے کے لیے اس کو قبول کیا۔ اسی طرح ایک خاص مقصد کے لیے ایک خاص طرز پر جماعت کو تبدیلی کا صورت گر بنایا۔ پھر انھوں نے جماعت کے ساتھ معاشرے کے ہر طبقے کو فعال طور پر ساتھ لے کر چلنے کے لیے برادر تنظیموں کا ایک وسیع نظام کار وضع کیا۔

ایک اور مثال ہے، ان کا لیکچر: اسلام کا نظریۂ سیاسی، جو تقسیم ہند سے ۱۰ برس قبل شائع ہوا تھا۔ اس میں مولانا نے امیر کے لیے زندگی بھر مامور رہنے اور شوریٰ کے مقابلے میں حق استرداد کو خلافت راشدہ کے تعامل سے لیا تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ مولانا کے ہاں ہمیں دیانت اور علمی توسع کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ انھوں نے اپنی بات کو ہمیشہ دلیل اور اعتماد سے پیش کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی افہام و تفہیم اور دلیل سے اپنی رائے بدلنے پر آمادہ رہے ہیں۔ ایسے ہر مشاہدے سے مولانا کی عظمت کا نقش گہرا ہوا ہے۔ جب اسلامی دستور کی تدوین کا مرحلہ آیا اور میں نے مولانا کی اسلامی قانون کی تدوین والی تقریر کو Islamic Law & Constitution میں شامل کر کے اس کتاب کو مرتب کرنے کے لیے کام شروع کیا تو اس موقع پر مولانا ظفر احمد انصاری، چودھری غلام محمد اور غلام حسین عباسی صاحب کے ہمراہ، مولانا مودودی سے ان معاملات پر گفتگو میں ہوئیں۔ مولانا بہت کھلے دل سے ہماری گزارشات پر غور فرمایا اور اس مکالمے کے نتیجے میں متعدد امور میں انھوں نے اپنی رائے میں ترمیم کی۔ مثال کے طور پر، امیر کے سلسلے میں مولانا نے رائے تبدیل کی اور کہا کہ دو امارت مقید ہو سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خلفائے راشدین تو تقویٰ کردار اور اپنی خدمات کے اعتبار سے بہت اونچے مقام پر تھے، پھر وہ محض منتخب سربراہ ہی نہیں تھے بلکہ تحریک اسلامی کے ستون اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اور افضل ترین حضرات تھے اس لیے ان کے اوپر یہ بھروسہ کیا جاسکتا تھا لیکن اگر آج ایک آدمی اختیار اور اقتدار کے سرچشموں پر قابض ہو جاتا ہے تو سوال یہ ہے کہ اسے ہٹانے کا راستہ کیا ہوگا۔

اسی طرح امیر یا لیڈر کو بھی شوریٰ کی رائے کا پابند ہونا چاہیے۔ مولانا مودودی کے ہاں اس میں بھی ایک ارتقا ہے، جس کا نقطہ عروج تفسیر القرآن میں سورہ شوریٰ وَأْمُرْهُمْ بِسُورَىٰ بَيْنَهُمْ ص (۳۲:۳۸) پر تفسیری نوٹ ہے، جو پورے تفسیری لٹریچر میں منفرد شان کا حامل ہے۔ اس میں مولانا نے لکھا ہے: ”مشاورت اسلامی طرز زندگی کا ایک اہم ستون ہے اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف جاہلیت کا طریقہ ہے بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کی صریح خلاف ورزی ہے..... جس معاملے کا تعلق دو یا زائد آدمیوں کے مفاد سے ہو اس میں کسی ایک شخص کا اپنی رائے سے فیصلہ کر ڈالنا اور دوسرے متعلق اشخاص کو نظر انداز کر دینا زیادتی ہے..... اگر وہ کسی بہت بڑی تعداد سے متعلق ہو تو ان کے معتمد علیہ نمائندوں کو شریک مشورہ کیا جائے..... جن معاملات کا تعلق دوسروں کے حقوق اور مفاد سے ہو، ان میں فیصلہ کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ کوئی شخص جو خدا سے ڈرتا ہو، اور یہ جانتا ہو کہ اس کی کتنی سخت جواب دہی اسے اپنے رب کے سامنے کرنی پڑے گی، کبھی اس بھاری بوجھ کو تنہا اپنے سر لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس طرح کی جراتیں صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے فکر ہوتے ہیں..... اسلامی طرز زندگی یہ چاہتا ہے کہ مشاورت کا اصول ہر چھوٹے بڑے اجتماعی معاملے میں برتا جائے۔ گھر کے معاملات ہوں تو ان میں میاں اور بیوی باہم مشورے سے کام کریں اور بچے جب جوان ہو جائیں تو انھیں بھی شریک مشورہ کیا جائے..... خاندان کے معاملات ہوں تو ان میں کنبے کے سب عاقل و بالغ افراد کی رائے لی جائے..... ایک پوری قوم کے معاملات ہوں تو ان کے چلانے کے لیے قوم کا سربراہ سب کی مرضی سے مقرر کیا جائے..... اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غلطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اس پر ٹوک سکیں، احتجاج کر سکیں اور اصلاح نہ ہوتی دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے اور ان کے ہاتھ پاؤں کس کر اور ان کو بے خبر رکھ کر ان کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بددیانتی ہے“ (تفسیر القرآن، ج ۳، ص ۵۰۸-۵۰۹)۔ یہی چیز امیر اور لیڈر کے لیے ہے۔ اکثریت کی رائے کو قبول کرنا اور اجماع پسندیدہ امر ہے۔ یہ آثار اپنے ارتقا کے ساتھ ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔

پھر جب تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں جماعت اسلامی کے دستور کی تشکیل ہوئی تو اس میں امیر کی مدت پانچ سال مقرر کر دی گئی۔ یہ وہی وقت ہے جب ہم نے دستور میں سربراہ حکومت کے لیے پانچ سال کی مدت تجویز کی تھی جسے مولانا نے قبول کر لیا تھا۔ اسی طرح جماعت کے پہلے دستور میں شوریٰ کا ادارہ موجود تھا، لیکن ان ارکان شوریٰ کو امیر ان افراد کی قابلیت، بصیرت، خدمات اور تقویٰ کی بنیاد پر نامزد کرتا تھا۔ اس کے بعد شوریٰ کو منتخب کرنے کا ضابطہ بنایا گیا۔ شوریٰ منتخب کرنے کے لیے بھی دو نوعیت کے حلقے بنائے گئے۔ ایک کل پاکستان سطح پر انتخاب رکھا گیا، جس میں پانچ افراد کا انتخاب تھا اور باقی تمام ارکان شوریٰ کو علاقائی حلقوں کی بنیاد پر منتخب کرنے کا ضابطہ مقرر کیا گیا تھا۔ پھر ۱۹۵۷ء کے دستور جماعت میں کل پاکستان بنیاد پر انتخاب کی الگ سے شق ختم کر دی گئی اور تمام علاقوں سے منتخب ارکان کی شوریٰ مقرر کی گئی۔ پھر ۱۹۵۲ء کے دستور میں شوریٰ کے بارے میں یہ شق تھی کہ امیر اور شوریٰ اتفاق رائے سے کام کریں گے۔ لیکن اگر شوریٰ اور امیر میں نزاع ہو تو کچھ امور میں شوریٰ امیر کی رائے مان لے گی خصوصیت سے جن کا تعلق نصوص کی تعبیر سے ہو اور کچھ امور میں امیر شوریٰ کی رائے کو فوقیت دے گا خصوصاً انتظامی معاملات کے بارے میں۔ لیکن جب معاملات میں شوریٰ امیر کی بات ماننے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر معاملہ ارکان میں بھیجا جائے گا اور اگر ارکان جماعت شوریٰ کی رائے کو مان لیں تو پھر امیر مستعفی ہو جائے گا اور اگر ارکان امیر کی رائے کو مان لیں تو شوریٰ مستعفی ہو جائے گی۔ پھر ۱۹۵۷ء کے دستور جماعت میں یہ بات لائی گئی کہ امیر اور شوریٰ اتفاق رائے سے کام کریں گے لیکن اگر اختلاف ہو تو امیر کو یہ حق ہوگا کہ وہ ایک سیشن کے لیے فیصلے کو مؤخر کر دے اور اگلے سیشن میں شوریٰ جو بھی فیصلہ کرے اسے امیر مان لے۔ یہاں بھی وہی مشاورت، افہام و تفہیم اور شوریٰ کی بالادستی کا ارتقا ہے۔

اسی طرح مولانا کی رائے تھی کہ عورتوں کی شوریٰ الگ ہونی چاہیے اور مردوں کی الگ۔ لیکن جب عملی مشکلات اور بعض مختلف فیہ امور پر افہام و تفہیم کے پہلو پر مولانا سے تبادلہ خیال ہوا تو انھوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ عورتیں بھی شوریٰ کی ممبر بن سکتی ہیں۔ اسی طرح غیر مسلموں کے بارے میں مولانا کی پہلے رائے یہ تھی کہ انھیں انتظامی امور میں مشورے میں شریک ہونا چاہیے اور ان کی شوریٰ الگ بنانی جائے۔ لیکن جب مولانا سے اس سلسلے میں تفصیل سے گفتگو ہوئی تو اس میں مولانا نے غور و فکر کے لیے خاصا وقت لیا۔ بالآخر وہ خود اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر دستور میں قرآن و سنت کی بالادستی ہو اور کوئی قانون سازی اسلام کے خلاف نہ ہو اور اسمبلی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہو تو ایسی صورت میں غیر مسلم بھی پارلیمنٹ کے ممبر بن سکتے ہیں جہاں وہ سارے معاملات میں رائے دیں گے اور رائے دہی میں بھی شریک ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

امت کو منزل مقصود پر پہنچانے کے لیے مولانا مودودی نے وسعت اور کشادہ روی کا انقلابی، جمہوری اور شوریٰ راستہ دکھایا۔ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ پہلے ایک ملک میں تبدیلی آنی چاہیے پھر وہی ملک دوسرے ممالک میں تبدیلی لانے کے لیے ماڈل بنے گا۔ ان کی دعوت کا اولین ہدف اپنا وطن ہے، لیکن روئے سخن پوری دنیا کی طرف ہے۔ عربی اور انگریزی میں اہم تصانیف اور تحریروں کے تراجم کا کام مولانا نے جماعت کے قیام کے ساتھ ہی شروع کروا دیا تھا۔ جماعت کی رودادوں میں ایک لمبی فہرست ملتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنی بات اور اپنی آواز دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں تک پہنچانے کے لیے کیا کوشش کی ہے گویا کہ پورا عالم (global reach) ابتدا ہی سے ان کے پیش نظر رہا ہے۔

● تحریک اور تنظیم کا فرق: ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے نتیجے میں بھارت اور پاکستان میں جماعت اسلامی الگ الگ ہو گئی۔ مولانا کی پیش کردہ دعوت قبول کرنے والے بعض اصحاب نے سری لنکا، مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر میں بھی اپنے طور پر جماعت بنائی۔ پھر مشرقی پاکستان کے تسلسل میں بنگلہ دیش میں بھی جماعت قائم ہوئی۔ جنوب مشرقی ایشیا میں ان چھ جماعتوں کے مابین کسی درجے میں بھی کوئی تنظیمی تعلق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مولانا نے کہیں بھی جماعت اسلامی کو قائم کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ۱۹۶۳ء میں جب ہم جیل میں تھے تو ہمیں جیل میں معلوم ہوا کہ برطانیہ کے کچھ مخلص مگر جذباتی نوجوانوں نے جماعت اسلامی کے نام سے کام شروع کر دیا ہے۔ تب ہم نے مولانا مودودی کی ہدایت پر جیل ہی سے ان کو یہ ہدایت بھیجی کہ: ”آپ جماعت کے نام سے کام نہ کریں، بلکہ آپ کا جو نام وہاں پہلے سے تھا، اسی کے تحت کام کریں اور مقامی قانون کے تحت کام کریں۔ نہ جماعت آپ کی ذمہ داری لے سکتی ہے اور نہ آپ کے لیے یہ مناسب ہے کہ آپ اس نام سے وہاں کام کریں۔“ یہی اصول مولانا کا رہا ہے۔

اس طرح تحریک و تنظیم کے مابین ایک فرق بھی ہمارے سامنے آیا کہ اسلامی انقلاب کے لیے تحریکات تو ساری دنیا میں برپا ہوں، لیکن تنظیم ہر جگہ وہاں کے حالات کے مطابق الگ آزاد اور اپنے قول و فعل کے لیے خود جواب دہ ہو۔ دنیا بھر میں اسلام کے لیے کام کرنے والی تحریکیں گویا کہ وسیع تر عالم گیر اسلامی تحریک کا حصہ ہیں، لیکن ان میں سے کسی کے ساتھ جماعت اسلامی پاکستان کے نظم کا اور قانونی اور دستوری تعلق (link) نہیں ہے۔ آج بھارت، کشمیر، سری لنکا اور بنگلہ دیش میں جماعت کے نام سے کام ہو رہا ہے، فکری یکسانیت بھی ہے، لیکن طریق کار، حالات، ضروریات، دستور اور قیادت ہر مقام نے اپنے طور پر متعارف کرائے ہیں۔ یہ مولانا کی عملیت پسندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

● جماعتی تشخص اور اشتراک عمل: اسلامی انقلاب اور اسلامی تبدیلی کے لیے عملی سطح پر اور میدان کار میں مولانا مودودی کے ہاں ایک چمک، خود بینی اور وسعت پائی جاتی ہے، جس میں دوسرے ہم مقصد افراد اور عناصر سے تعاون کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پاکستان میں ۱۹۴۹ء میں سول لبریریونین کا قیام عمل میں آیا تو اس میں کمیونسٹ پارٹی بھی شامل تھی۔ بعد ازاں متحدہ حزب اختلاف (COP)، پاکستان تحریک جمہوریت (PDM)، جمہوری مجلس عمل (DAC)، متحدہ جمہوری محاذ (UDF) اور پھر پاکستان قومی اتحاد (PNA) کا قیام ہے۔ اس عمل میں مولانا مودودی نے اپنی جماعت کے تشخص کو محفوظ رکھتے ہوئے، مشترک نکات پر دوسرے سیاسی اُمدادی اور سماجی عناصر کو ساتھ ملا کر چلنے کی مثال پیش کی ہے۔

مولانا مودودی ہی کی قیادت میں جماعت اسلامی نے اسلامی دستور کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ ’قرارداد مقاصد‘ کی منظوری (مارچ ۱۹۴۹ء) کے وقت بلاشبہ مولانا مودودی، سنٹرل جیل ملتان میں تھے، لیکن اگر مولانا نے اسلامی قانون کے موضوع پر پنجاب یونیورسٹی لاکاچ، میں تقریر نہ کی ہوتی، اور وہ چار نکاتی پروگرام پوری قوم کے سامنے پیش نہ کیا ہوتا تو ’قرارداد مقاصد‘ بھی پاس نہ ہوتی۔ یہ مولانا کی فکر، وژن اور جدوجہد تھی، جسے قبولیت عام حاصل ہوئی۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم، مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم اور چودھری غلام محمد مرحوم کی کوشش سے ’قرارداد مقاصد‘ کا جو مسودہ پہلی دستور ساز اسمبلی نے منظور کیا، یہ مسودہ اسمبلی میں پاس ہونے سے قبل ملتان جیل میں مولانا مودودی کو دکھایا گیا اور ان کی رضامندی کے بعد ہی وہ اسمبلی کے فلور پر پیش اور پھر منظور ہوا تھا۔

۱۹۵۱ء میں علما کے ۲۲ نکات کی منظوری کے تاریخی لحاظ کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ اس وقت میں اسلامی جمعیت طلبہ میں تھا۔ اس سلسلے میں علما کی جو نشست ہو رہی تھی، اس میں راجہ بھائی [ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری]، خرم بھائی اور میں ان بزرگوں کے خادم کی حیثیت سے شریک تھے۔ جب پہلا اجلاس ہوا تو اس میں دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ مگر کسی کے سامنے یہ بات واضح نہیں تھی کہ ہم نتیجے پر کیسے پہنچ پائیں گے۔ ان دھواں دھار تقاریر کے آخر میں مولانا ظفر احمد انصاری صاحب نے تجویز دیتے ہوئے کہا کہ: ”اس طرح کی تقریروں میں تو ہم کئی دن صرف کر دیں گے اور کچھ نتیجہ نہیں نکل سکے گا۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ اس اجلاس کو موخر کر دیتے ہیں۔ اجلاس کے شرکاء میں سے ہر شخص تحریر کر دے کہ اسلامی ریاست کے بنیادی اصول کیا ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد ایک میٹھی بنا دی جائے جس کے سربراہ مولانا سید سلیمان ندوی ہوں، ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے میں ان تجاویز کی روشنی میں ایک مسودہ تیار کر لیتا ہوں، اور پھر اس مسودے پر بحث کر کے کسی متفقہ لائحہ عمل کو منظور کر لیں گے“۔ سب نے اس تجویز کو بڑا پسند کیا۔

ہر ایک عالم دین کو سادہ کاغذ دے دیے گئے، پیش تر نے لکھا۔ سب سے طویل مضمون مولانا راغب احسن مرحوم نے لکھا، لیکن وہ مضمون لفاظی اور جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ ان سب کے برعکس مولانا مودودی نے پنسل سے فل اسکیپ کا ڈیڑھ صفحہ لکھا، جس میں انھوں نے منطقی ربط کے ساتھ بڑے اختصار اور جامعیت سے بھرپور نکات بنا کر دیے کہ یہ اور یہ چیزیں ہونی چاہئیں۔ چنانچہ علما کے ۲۲ نکات کی بنیاد وہی مسودہ بنا، تاہم آخری مسودہ مولانا ظفر احمد انصاری نے اپنے قلم سے لکھا۔ مولانا انصاری مرحوم کا مسودہ کم و بیش مولانا مودودی کی تحریر ہی پر مبنی تھا۔ اس دوران مولانا سلیمان ندوی استراحت فرما رہے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، انھوں نے دو تین جگہ جزوی ترمیم و اضافہ کیا۔ پھر اجتماع بلایا گیا۔ اس اجتماع میں سب سے پہلے اس کو پورا پڑھا گیا، پھر ایک ایک نکتے کی خواندگی ہوئی اور بالکل جس طرح حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام قبائل کے سربراہوں کو حجر اسود اٹھا کر دیوار کعبہ میں نصب کرنے میں شریک کر لیا تھا، اس طرح اس شرکت سے الحمد للہ یہ نکات متفقہ طور پر منظور ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی مولانا مودودی اور مولانا انصاری کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔

جب علما کی دستوری ترمیم اور سفارشات آئیں تو اس میں متفقہ طور پر جو چیزیں مرتب ہوئیں ان میں بھی مولانا مودودی کا سب سے زیادہ تعمیری اور تحریری حصہ تھا، تاہم اس میں دو تین اختلافی نوٹ بھی تھے اور وہ بہت معمولی نوعیت کے تھے۔ پھر جب ۱۹۶۱ء میں فیلڈ مارشل صدر ایوب خاں کے زمانے میں متنازع فیہ عائلی قوانین کا آرڈی نانس (MFLO) آیا تو مولانا مودودی ہی نے اس پر تنقید لکھی اور اس تنقید پر علما نے دستخط کیے، اور سب کی طرف سے وہ تنقید قوم کے سامنے آئی۔ اسی طرح ایوب خان کے دستوری کمیشن کے سوال نامے کا جواب بھی مولانا مودودی نے لکھا، اور پھر تمام علما اور سیاست دانوں نے اس کو دیکھا اور اس کو اپنایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی صلاحیت دی تھی۔ یہ ہماری تاریخ کے مختلف سنگ میل ہیں اور ان میں سے ہر سنگ میل پر مولانا مودودی کا نام اور کام ثبت ہے۔

● جمہوریت پسندی: خاص طور پر دینی حلقوں میں بھی اور پھر سیاسی حلقوں میں بھی ایک روایت بن چکی ہے کہ دینی حلقوں میں گدی اور سیاست میں بھی قیادت موروثی چلتی ہے۔ اور تو اور خود اب امریکہ میں بھی بڑے بڑے کے بعد چھوٹا بٹش برسر اقتدار ہے۔ اس فضا اور رواج میں مولانا نے قیادت میں تبدیلی کی مثال قائم کی۔

انہوں نے جماعت اسلامی کے قیام کے فوراً بعد فرمایا: ”مجھے ایک لمحے کے لیے اپنے بارے میں یہ غلط فہمی نہیں ہونی کہ میں اس عظیم الشان تحریک کی قیادت کا اہل ہوں، بلکہ میں تو اس کو ایک بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ اس وقت اس کا عظیم کے لیے آپ کو مجھ سے بہتر کوئی آدمی نہ ملا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے فرائض امارت کی انجام دہی کے ساتھ میں برہنہ تلاش میں رہوں گا کہ کوئی اہل تر آدمی اس کا بار اٹھانے کے لیے مل جائے۔۔۔۔۔ نیز ہمیشہ ہر اجتماع عام کے موقع پر جماعت سے بھی درخواست کرتا رہوں گا کہ اگر اب اس نے کوئی مجھ سے بہتر آدمی پایا ہے تو وہ اسے اپنا امیر منتخب کر لے۔ ان شاء اللہ، اپنی ذات کو کبھی خدا کے راستے میں سدا رہ نہ بننے دوں گا“۔ (روداد جماعت اسلامی، اول، ص ۳۳)

اس کے بعد دستور میں درج مستقل نظام کے تحت متعین وقت پر انتخاب امیر کے لیے انتخابات منعقد کرائے۔ پھر جب ۱۹۷۲ء میں انہوں نے محسوس کیا کہ اب صحت اس ذمے داری کو مزید اٹھانے کی اجازت نہیں دیتی تو انہوں نے رفقاے جماعت سے کہا: اب آپ میری زندگی میں اپنا نیا لیڈر منتخب کر لیں۔ ان کے الفاظ تھے: ”میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں جماعت نئے امیر پر جمع ہو جائے“۔ یہ ایک ایسی منفرد مثال ہے کہ جس کے اثرات کا اندازہ لگانے کے لیے گہری بصیرت کی ضرورت ہے۔ وہ شخص جو اپنی ذاتی جاگیر قائم کرنا چاہتا ہو، گدی قائم کرنا چاہتا ہو یا سیاست میں اس کا کوئی ذاتی مشن ہو، وہ کبھی ایسا جرات مندانہ اقدام نہیں کر سکتا۔ سچی بات ہے کہ جماعت کے لیے زندگی، نظیر، قیادت، شورا، نیت اور صحیح راستے پر قائم رہنے کے لیے اس مثال میں بڑی عظیم رہنمائی موجود ہے جسے سید مودودیؒ کی تاریخ ساز اور عہد آفریں شخصیت نے پیش کیا۔

● شورائیت اور اجتماعی اجتہاد: مولانا کی حکمت کار میں ایک بڑی اہم چیز رچی ہوئی ہے اور وہ ہے شورے، اجتماعیت، اختلاف رائے اور بحث و مباحثے کی آزادی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے خود اجتہاد کے بارے میں بھی کئی بار کہا ہے کہ اس کے لیے شوری کا نظام اور اجتماعی اجتہاد کی سہیل پیدا ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ آج کے دور میں کسی ایک فرد کے لیے بڑا مشکل ہے کہ وہ ان تمام علوم پر جامع انداز سے گرفت رکھتا ہو، جو روزمرہ اور عصر حاضر میں پیش آمدہ امور پر فتنی چیلنجوں کا جواب دینے کے لیے ضروری ہیں۔ اگر ایک فرد سے یہ نہیں ہو سکتا تو پھر اس بات کی ضرورت ہے کہ مختلف صلاحیتیں رکھنے والے افراد مل کر باہم مشاورت اور افہام و تفہیم (interaction) سے معاملات کو طے کریں۔

علامہ اقبالؒ نے اس مسئلے پر بحث کی ہے اور مولانا مودودیؒ بھی اس میں بہت گہرائی تک گئے ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے عصری تجربات، خصوصیت سے پارلیمنٹ کے وجود، انتخابی عمل، دستوری انداز، قانون سازی کے اسلوب، عدلیہ کی آزادی اور افراد کی آزادی اور حقوق۔۔۔ غرض ان تمام چیزوں کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ پھر اسلامی راسخ العقیدگی اور قرآن و سنت سے وابستگی قائم رکھتے ہوئے نہ صرف دوسروں کو ان پر کار بند ہونے کا نہ صرف راستہ دکھایا، بلکہ خود بھی انہیں قبول کر کے دکھایا ہے۔ مولانا مودودیؒ کی فکر کا یہ حرکی اور لچک دار رویہ عصر حاضر کے مسائل و معاملات میں ہوا کا تازہ جھونکا اور فکر و دانش کے گلستان کا بہار آفریں منظر پیش کرتا ہے۔

مولانا مودودیؒ کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں ایک منفرد علم الکلام دیا ہے۔ اسی ذیل میں مولانا مودودیؒ نے مسلم تاریخ کا محاکمہ (critique) لکھا ہے جو محض محاکمہ نہیں ہے، بلکہ تاریخ کو دیکھنے کا ایک منفرد اسلوب اور زاویہ ہے۔ مولانا مودودیؒ تجدید و احیاء دین، خلافت و ملوکیت، سلاجقہ اور تحریک آزادی ہند اور مسلمانوں کے علاوہ تفہیم القرآن کے اوراق میں ہمیں رہنمائی دیتے ہیں کہ ہمیں تاریخ کو کیسے دیکھنا چاہیے اور ہم اس کی تعبیر کیسے کریں؟ ہم محبت یا نفرت کے جذبے سے مغلوب ہونے کے بجائے اپنے اندر عدل کی حس کو بیدار کریں۔

تاریخ کے اوراق اور ادوار میں تعمیر و تخریب، اطاعت و انحراف، ظلم اور عدل، سنت اور بدعت کی موجودگی ہمیں نظر آئے، تاکہ ہر موقع پر کھلے ذہن کے ساتھ قوس قزح کے سب رنگ دیکھے جاسکیں۔ جہاں کہیں بنیادی اصول میں کوئی ایسا انحراف نظر آئے جو کل نظر ہو یا قرآن و سنت کے مزاج سے مناسبت نہ رکھتا ہو تو پھر اس پر تنقید بھی ہو سکے اور اس کی تصحیح بھی۔ اس کو مولانا مودودی کے علم الکلام کا ایک حصہ تصور کیا جائے یا اپنی جگہ ایک مستقل علمی کارنامہ بہر حال یہ بھی مولانا کی ایک بڑی شان دار اور ناقابل فراموش خدمت ہے۔

اسلامی انقلاب کا ایک منفرد ماڈل

یہ امر واقعہ ہے کہ مولانا مودودی نے فکر بھی دی اور فکر کے ساتھ سوچنے کا اسلوب بھی دیا۔ انھوں نے امت مسلمہ کی ذمہ داری اور اس کا مشن متعین کیا، اس کے لیے اسے بیدار کیا اور آگاہ کیا کہ ہم محض معاشی ترقی حاصل کرنے والی ایک قوم نہیں ہیں، بلکہ ہم ایک صاحب مشن اور صاحب شریعت قوم ہیں۔ اس صلاح مشن قوم کو ملنی اور پھر عالم گیر سطح پر کامیاب کرانے کے لیے حکمت کار اور حکمت عملی کو پیش کیا۔ اسی حکمت کار کا ایک حصہ جماعت اسلامی کا قیام ہے جس میں فکر ہے، اور عمل کا وسیع دائرہ ہے۔ اس طرح مولانا مودودی نے اسلامی انقلاب کا بالکل نیا ماڈل دیا، اور نہ صرف ماڈل دیا، بلکہ اس کے اوپر عمل کر کے بھی دکھایا۔

مولانا کے علمی کام میں سب سے بڑا کارنامہ تفہیم القرآن ہے۔ تجدید و احیاء دین کے تصور میں قرآن کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بات خود مولانا نے مجھ سے فرمائی ہے: ”جب جماعت قائم ہوئی تو اس کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ اس جماعت کا تعلق قرآن سے قائم کروں اور جو کچھ میں نے قرآن سے سمجھا ہے، اسے اس طریقے سے بیان کروں کہ جماعت اور پوری قوم قرآن کی روشنی کے دائرے میں آجائے، اور وہ قرآن سے تعلق قائم کر کے اس میں شریک ہو سکے، تاکہ جو تبدیلی میرے پیش نظر ہے اور جس کا ماخذ، جز اور بنیاد قرآن ہے اس تک رسائی حاصل کی جاسکے“۔ یہ وہی کام ہے جو شاہ ولی اللہ مرحوم نے اپنے دور میں کیا۔ اس طرح مولانا کی احیائی فکر کے اندر تفہیم ایک پیمانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تفہیم کی شکل میں جتنی بڑی نعمت اللہ تعالیٰ نے مولانا مودودی کے ذریعے اس دور میں اس امت کو دی ہے، اس پر اپنے خالق و مالک کا جتنا شکر ادا کیا جائے وہ کم ہے۔ تفہیم القرآن مولانا کے فکری کام کا سب سے مرکزی اور سدا بہار کارنامہ (ever-lasting) ہے۔ یہ مولانا کے علم الکلام کا بھی بہترین مرتع ہے۔ اس میں مولانا کی چند اولیات بھی ہیں جن میں ترجمے کی جگہ ترجمانی، ہر سورہ کا مقدمہ اور پھر ترجمے میں پیرا گراف بندی قابل ذکر ہیں۔

مولانا کے فکری اور علمی اثاثے میں ایک اور چیز ان کے ہاں پائی جانے والی تازگی اور تخلیقیت (originality) ہے۔ انھوں نے اپنے دور کے اور ماضی کے لکھنے والوں سے بھی استفادہ کیا، لیکن وہ دوسروں کے خیالات کے اسیر نہیں بنے، بلکہ جس طرح ایک صحت مند انسانی جسم غذا کو ہضم کر کے نیا خون بناتا ہے، اسی طرح اپنے دور اور ماضی کے افکار سے استفادہ کر کے انھوں نے قرآن و سنت کے فہم کی روشنی میں خود تھکھیل نو کا کام انجام دیا ہے۔

اس سلسلے میں ان کا ایک اور منفرد کارنامہ اسلام اور جاہلیت کے مابین فرق کو واضح کرنا ہے جس کے آئینے میں وہ انسانیت کی پوری تاریخ میں برپا معرکے کو پرکھتے ہیں۔ دور حاضر میں جن منکرین نے بھی ’جاہلیت‘ کے تصور پر کلام کیا ہے، انھوں نے یہ کام مولانا مودودی ہی کی جلائی ہوئی شمع کی روشنی میں کیا ہے۔ مولانا کی فکر میں ’جاہلیت‘ علم کے معدوم ہونے کا نام نہیں، بلکہ اللہ کی ہدایت کے بغیر انسانی زندگی --- فکر و عمل کو منظم و مرتب کرنے کے مثالیہ (paradigm) سے عبارت ہے۔ اسلامی فکر کی تنظیم اور حق و باطل کی تاریخی کش مکش کو سمجھنے کے لیے مولانا کا یہ تصور ایک شاہ کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔

قرآن کی بنیادی اصطلاحیں ان کی ایک نہایت بنیادی کتاب ہے جس میں انھوں نے قرآن کی بنیادی اصطلاحات الہ رب عبادت اور دین کا صحیح مفہوم اخذ اور متعین کر کے ایک قسم کی شاہ کلید فراہم کر دی ہے، جس سے پوری اسلامی فکر کی تاریخ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کی روشنی میں ہمیں قرآن نہیں کے لیے ایک روشن اور کشادہ راستہ مل جاتا ہے۔

مولانا مودودی نے مغربی تہذیب کے بارے میں بھی بڑا متوازن رویہ اختیار کیا۔ بحیثیت مجموعی مسلم دنیا میں اگر ایک طرف مغرب کے مکمل استرداد (rejection) کا رویہ پایا جاتا تھا تو دوسری جانب عملاً آنکھیں بند کر کے سپر ڈالنے اور معذرت خواہانہ انداز میں دین کی توجیہ کرنے والے تھے۔ مولانا مودودی نے مغربی تہذیب، اس کے اصولوں، اس کی بنیادوں، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا تجزیہ کیا اور تقلید یورپ اور اندھی غلامانہ ذہنیت کو مسترد کر دیا، مگر ساتھ یہ بھی کہا کہ مغرب میں ہر چیز غلط نہیں اور اس کی ترقی کے کچھ حقیقی (genuine) اسباب ہیں۔ ان اسباب سے صرف نظر کر کے محض اندھی مخالفت کوئی صحت مند رویہ نہیں ہے۔ ساتھ ہی واضح کیا کہ مغرب سے مرعوبیت، اس کی فکری بنیادوں کو بلا تنقید قبول کر لینا اور ”چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی کارو یہ نہ عادلانہ ہے اور نہ عادلانہ۔ مولانا مودودی نے درمیان کا راستہ نکالا۔ دیگر علما اور مولانا مودودی میں یہی بنیادی فرق ہے۔

مولانا کے ہاں جو بائع نظری، مغربی تہذیب کا فہم اور حقیقت پسندانہ طریق کار ہے، اسی وجہ سے عصر حاضر میں تحریک اسلامی نے مسائل کو حل کرنے کے لیے متوازن رویہ اختیار کیا ہے۔ مولانا مودودی نے یہ رویہ صرف مغربی تہذیب کے بارے میں اختیار نہیں کیا، بلکہ مسلمانوں کی فکریات کے بارے میں بھی ان کا رویہ یہی رہا ہے۔ بحیثیت مجموعی انھوں نے حنفی مکتب فکر کو ترجیح دی اور قبول کیا ہے۔ عبادت میں اسی طریقے پر عمل کیا ہے۔ معاملات کی حد تک ان کا ذہن یہی تھا کہ چاروں مکاتب فکر کا مطالعہ کرنا چاہیے اور خصوصیت کے ساتھ جدید معاملات اور مسائل کا حل نکالنے کے لیے ان کے دائرے کے اندر جو رہنمائی جہاں سے بھی میسر آئے، اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ انھوں نے ان مسلمہ مکاتب فکر میں سے کسی کو مسترد یا باطل قرار نہیں دیا، بلکہ ان کے ہاں اس علمی اور عملی اختلاف رائے کو محترم تصور کرنے کا رویہ نمایاں طور پر موجود ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے شیعہ مکتب فکر سے بھی تہذیبی حد تک ربط رکھا اور اُمت کی وحدت کے لیے کوشاں رہے۔

اسی تسلسل میں اتحاد اُمت مسلمہ کے لیے ان کے ہاں ایک خاص انداز فکر پایا جاتا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ اس اتحاد کی بنیاد بہر حال اسلام ہی کو ہونا چاہیے۔ مسلمان ملکوں کے مفادات کی بنیاد پر اگر آپ یہ کوشش کریں گے تو کامیابی محال ہے۔ مفادات کا ایک جائز مقام ہے، لیکن مفادات، اسلامی مفاد اور شخص کے تابع ہونے چاہئیں۔ اس اتحاد کی کوئی ایک لگی بندھی شکل نہیں ہے۔ جیسا کہ اقبال نے بھی کہا ہے کہ ابتدائی مرحلے میں یہ ایک قسم کی مسلم دولت مشترکہ ہو سکتی ہے جس میں آہستہ آہستہ تعاون بڑھتا رہے اور بالآخر کوئی زیادہ مضبوط و مستحکم چیز بن سکے۔ اس سلسلے میں سعودی فرماں روا شاہ فیصل مرحوم کی ’تضامن اسلامی‘ کی تحریک اور پہلے مسلم سربراہی اجتماع [رباط مراکش-۱۹۶۹ء] کے موقع پر اُمت مسلمہ کے اتحاد کے لیے جو نقشہ کار انھوں نے پیش کیا، وہ ایک تاریخی دستاویز ہے، جس میں نظریاتی اتحاد اور عملی مسائل کے اجتماعی حل کے لیے موثر تدابیر اور انتظامات کی نشان دہی کی گئی۔

اس حوالے سے یہ وضاحت ضروری ہے کہ مولانا مودودی نے صرف مسلمانوں کے مفاد کے لیے ہی کام نہیں کیا ہے، بلکہ عملی اور فکری سطح پر ان کی نگاہ بلا تھکھی رنگ و نسل اور بلا تفریق مشرق و مغرب تمام انسانوں پر رہی ہے۔ وہ تمام انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے، تمام انسانوں کو جہنم کی آگ سے بچانے اور دنیا بھر کو فتنہ و فساد سے محفوظ رکھنے اور نظام عدل قائم کرنے کی جہانی دعوت دیتے رہے ہیں۔ تہذیبی، فکری اور ثقافتی سطح پر مولانا مودودی کے مثالی اسلوب کار کا تجزیہ کریں تو اسے عالم گیریت یا آفاقیت پر مبنی اسلوب کار کا نام دیا جاسکتا ہے جس کا مقصد بنی نوع انسان کی فوز و فلاح، بہبود اور ان کی نجات ہے۔ اسی طرح اللہ سے انسانوں کے رشتے کو جوڑنا اور انسانوں کے درمیان انصاف اور اخوت کی بنیاد پر معاشرتی، معاشی اور بین الاقوامی معاملات کو حل کرنا ہے۔ جو افراد مولانا مودودی کے افکار کے صرف کسی ایک جزو کو لیتے ہیں تو ان کے ہاں الجھنیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن اگر مولانا کی پوری فکر کو لیا جائے تو اس کی حیثیت ایک ایسے گلدستے کی سی ہے جس کے سارے پھول اپنے مقام پر ہیں اور اس گلدستے کی تصویر ابھرنی ہی اس کے مجموعی (macro) وجود سے ہے۔

مولانا مودودی بہر حال ایک انسان تھے اور ماسوا انبیاء کرام، کوئی انسان غلطی سے مبرا نہیں ہے۔ مولانا مودودی نے بھی دعویٰ نہیں کیا اور نہ اس زعم میں رہے کہ ان کی رائے ہی سچ ہے۔ اس کے برعکس ہمیشہ انہوں نے مکالمے اور بحث کو پسند کیا، اختلاف کو دبا یا نہیں۔ اس بات کا نہ صرف اظہار کیا، بلکہ اس پر عمل کر کے دکھایا۔ کسی موقع پر اگر ان کی کسی غلطی یا دلیل کی کوئی کمزوری سامنے لانی گئی تو انہوں نے کھلے دل کے ساتھ اس سے رجوع کر لیا۔ ان کی کتاب رسائل و مسائل کا مطالعہ کریں تو اس میں ایک نہیں، دسیوں مقامات ہیں جہاں مولانا نے اپنی رائے سے رجوع کیا ہے۔ کسی صلابت علم کے متوجہ کرنے پر انہوں نے مسئلے یا معاملے کو چھپایا نہیں، اس کی سچائی کی ہے اور اس تبدیلی کو خود ریکارڈ کیا ہے۔

مولانا مودودی اپنے فکری ارتقا میں دو صحافت سے دو تصنیف کی طرف اور پھر دور اصلاح و جدوجہد کی طرف بڑھے۔ ان میں سے ہر دور کے مسائل اور حالات الگ الگ تھے، جن کی مناسبت سے انہوں نے غور و فکر جاری رکھا اور اصل سے رشتے کو مضبوط رکھتے ہوئے قرآن و سنت کے نصوص پر سمجھوتہ یا انحراف کیے بغیر، مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ ان کی اجتہادی بصیرت، علمی دیانت اور مسائل و معاملات کے صحیح شعور و ادراک کا ثبوت ہے۔ مولانا کے افکار و خدمات اپنی انفرادیت، وسعت اور گہرائی کی بنا پر، برسوں نہیں، صدیوں تحقیق کے محتاج ہیں اور آنے والی نسلیں اس سے روشنی حاصل کریں گی۔۔۔!

اللہ تعالیٰ مولانا مودودی کی خدمات کو شرف قبولیت اور فیضانِ عام بخشے اور ہمیں ان کے مشن کو صحیح خطوط پر آگے بڑھانے کی توفیق دے۔ آمین!

☆ خواہش تو یہی تھی کہ اس موضوع پر باقاعدہ اور مفصل مضمون لکھوں، لیکن صحت کی خرابی کے باعث حسب خواہش یہ خدمت انجام نہ دے سکا۔ مجبوراً ابراہیم عزیز سلیم منصور خالد کو کئی نشستوں میں مضمون املا کرایا اور یہ ان کی محنت کا حاصل ہے۔ ضروری ترمیم اور اضافوں کے ساتھ شمارے میں شامل کیا جا رہا ہے۔ میں ان کی اس محنت اور محبت کے لیے تہ دل سے ممنون ہوں۔ جزاء اللہ خیر الجزاء۔ (خ-۱)

**Get more e-books from www.ketabton.com
Ketabton.com: The Digital Library**